مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (2000ء تا حال)

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو

:\IMG-20200103-WA0042.jp
not found.

☆مقالہ نگار☆

آمنہ نایاب

رول نمبر ۱۵

☆نگران مقالہ☆

ڈاکٹر فرزانہ کوکب

اُستاد شعبۂ اُردو

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

سیشن: 20-2018ء

شعبۂ اُردو

بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

حلف نامہ

میں حلفیہ اقرار کرتی ہوں کہ یہ مقالہ بعنوان ''مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری:
تحقیقی وتنقیدی مطالعہ (2000ء تا حال)'' میری ذاتی کاوش اور محنت کا ثمر ہے۔
نیز یہ مقالہ اس سے پہلے کسی بھی یونیورسٹی میں ڈگری کے حصول کے لیے نہیں
پیش کیا گیا۔ یہ مقالہ اپنے موضوع سے متعلق اساسی اور اولین مصادر ماخذ پر مشتمل ہے۔

آمنہ نایاب

مقالہ نگار

تصدیق نامہ

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ میں نے ایم۔ فل کی طالبہ آمنہ نایاب
کے تحقیقی مقالہ بعنوان ''مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری: تحقیقی وتنقیدی
مطالعہ (2000ءتا حال)'' کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ میں طالبہ
کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں اور اجازت دیتی ہوں کہ ان کا یہ مقالہ
ایم۔ فل (اُردو) کی ڈگری کی جانچ کے لیے جمع کروا دیا جائے۔

ڈاکٹر فرزانہ کوکب
شعبۂ اُردو
بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

انتساب

قبلہ گاہی، والد مکرم و معظم اور ماں کے آنچل کے

نام

جن کی شفقتوں نے بنایا ''نکتہ داں مجھ کو''

فہرست ابواب

پیش لفظ

اللہ رب العزت کی بے انتہا نوازش کہ انہوں نے مجھے اس قابل بنایا کہ آج ایک معزز درسگاہ میں ایم۔ فل کا مقالہ جمع کروانے کے قابل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے صد شکر کے بعد جن لوگوں کی شکر گزار ہوں اُن میں سب سے پہلے اپنے والدین کی شکر گزار ہوں۔ والدہ محترمہ کی دعائیں، نیک تمنائیں اور محبتیں ہر لمحہ میرے ساتھ رہیں اور والد محترم جنہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ دُھوپ میں کھڑے گھنے پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں کا خیال آتا ہے، ان کی بے انتہا محبتوں اور ادبی و فکری معاونت کے بغیر میں آج اس مقام پر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، والدین کے بے شمار احسانات کے بدلے جتنا شکریہ ادا کیا جائے کم ہے، الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔

اپنی اس کامیابی کو میں اپنے والدین کی اُن دُعاؤں کے نام کرتی ہوں جو ساری زندگی ہماری محافظ بنی رہیں، اللہ پاک اُن کا سایہِ شفقت ہم پر سدا سلامت رکھیں۔(آمین)

کرونا کی وبا کے دنوں میں مقالہ لکھنا ایک مشکل مرحلہ تھا خاص طور پر مشرف عالم ذوقی کی کتب کا یہاں پاکستان میں میسر نہ ہونا میری مشکلات کی سب سے بڑی وجہ تھی، مشکور ہوں مشرف عالم ذوقی صاحب کی جنہوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔

زکریا یونیورسٹی کے شعبہ اُردو کے قابلِ احترام اساتذہ کرام کی بے حد ممنون ہوں جن کی رہنمائی نے میرے لیے ہر مشکل مرحلہ کو آسان کر دیا، نگرانِ مقالہ ڈاکٹر فرزانہ کوکب کی قدم قدم پر رہنمائی، حوصلہ افزائی اور فنی معاونت شامل نہ ہوتی تو یہ مرحلہ تحقیق طے نہ ہو پاتا۔

تمام دوست احباب اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے دورانِ تحقیق میری مدد کی۔

آمنہ نایاب

بابِ اوّل:

مشرف عالم ذوقی : سوانح، شخصیت و تصانیف

سوانح،شخصیت

۲۴مارچ ۱۹۶۲ءکو "چودھری مشکور عالم بصیری" کے گھر پانچویں بچے کی پیدائش ہوئی جس کا نام مشرف عالم رکھا گیا جو "مشرف عالم ذوقی" کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ [۱]

ذوقی نے آنکھ کھولتے ہی گھر میں علمی وادبی ماحول پایاان کے والد ادب سے اور خاص کر شاعری سے خاص شغف رکھتے تھے۔

ذوقی کی والدہ "سکینہ خاتون" سادہ مزاج کی گھریلو خاتون تھیں، والد سے بے پناہ عقیدت رکھنے والے ذوقی کی زندگی میں ان کی والدہ نے جو کردار ادا کیا وہ ذوقی کے اپنے کہے الفاظ میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

"میں نے یہ بات کہی کہ میرے ابو میرے Ideal تھے۔لیکن کہیں نہ کہیں میری کہانیوں میں جب مضبوطی کی بات آتی ہے۔جیسے میں نے کہا کہ میری کہانیوں کی عورتیں کبھی کمزور نہیں ہوتی۔ان میں، میں نے دو لوگوں کو دیکھا ان میں میری پتنی اور دوسری میری ماں جو کمزور نہیں ہیں۔۔۔" [۲]

"سکینہ خاتون" کا انتقال ۱۹۸۳ء میں مظفر پور میں ہوا جب ذوقی بی_اے کے طالب علم تھے۔

ذوقی کے والد "مشکور عالم بصیری" ایک عزت دار شخص تھےاور Deputy Director of Education تھے۔وہ نہ صرف شاعری کا شغف رکھتے تھے بلکہ خود بھی شاعری کیا کرتے تھے اور بصیری تخلص رکھتے تھے۔ذوقی نے ابتداء میں اپنے والد سے ہی اصلاح لی۔

غالب، میر، اقبال کا کلام، داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا جیسی نہ جانے کتنی کہانیاں وہ اپنے والد کی زبانی بچپن میں ہی سن چکے تھے۔

ذوقی کے ساتھ ان کے والد "مشکور عالم" کی خاص محبت تھی، ہر پہلو پر ان میں بحث ہوا کرتی ذوقی کو ہر قدم پر والد کی رہنمائی ملتی رہی یہی وجہ ہے کہ آج ذوقی ہر قدم پر والد کا قصیدہ پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"مشکور عالم" کی موت ذوقی کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھی ان پر اس کا گہرا اثر پڑا جس کا ذکر وہ اپنی کتاب "سلسلہ شب وروز" میں کرتے ہیں۔

"ان تین برسوں میں برے موسم کی زد پر، میں بھی رہا۔تین سال پہلے "سناٹے میں تارا" لکھتے ہوئے میں انتہائی فخر کے عالم میں اپنے فرشتہ جیسے باپ مشکور عالم بصیری کا قصیدہ پڑھ

رہا تھا اور آب یہ قلم خاموش ہے۔۔۔وہ مہربان شفیق چہروں والا باب ٦ مئی ۲۰۱۸ء کی
صبح، بادلوں کے کچھ بے حد حسین ٹکڑوں کے بیچ ہمیشہ کے لئے گم ہوگیا۔" [۳]

ذوقی کا بچپن ان کے پیدائشی علاقے محلّہ مہادیوہ آرہ میں گزرا بچپن سے ہی لکھنے، پڑھنے کے شوقین تھے بچپن سے ہی ان کو ادبی ماحول ملا جس کی وجہ سے ایک ادیب ان کے اندر پیدا ہونے لگا، عام بچوں کی طرح وہ کھیل کود میں کم دلچسپی رکھتے تھے سات سال کی عمر سے ہی انہوں نے قلم کو تھام لیا۔

"لٹو، گلی ڈنڈا، گولی سے لے کر کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور والی بال تک، مگر یہ کیا، آس پاس کے
معمولی بچوں سے بھی میں شکست کھا جاتا۔ دل میں یہ خیال آیا کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہر بار
ہر کھیل میں، میں ہار جاتا ہوں۔ یہ بار بار کی شکست کا صدمہ کچھ ایسا تھا کہ ہاتھوں میں قلم اٹھا
لیا۔ اب نہیں ہاروں گا صرف جیتوں گا۔" [۴]

بچپن سے ہی ذوقی کو پڑھو پڑھو کا نعرہ سننے کو ملا ان کے والد کا کہنا تھا" دنیا میں کچھ بھی کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے پڑھنا پڑے گا۔"

تعلیم کا آغاز انہوں نے قرآن پاک سے کیا، ابتدائی تعلیم انہوں نے آرہ کے "شاہ آباد" اسکول سے لی، میٹرک انہوں نے "جین اسکول" سے کی جو اس وقت آرہ کا سب سے بڑا اسکول مانا جاتا تھا۔

ذوقی اپنے اسکول کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں ملاحظہ کریں۔

"میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ تب میں نے پہلی بار ایک ریڈیو کا یہ کار یہ کرم کیا تھا۔ اس وقت
میرے ہندی کے گرو ہند کے بہت بڑے ساہتیہ کار" مدھوسنگھ" تھے۔ مجھے یاد ہے۔ اس دن
مدھوسنگھ نے کلاس کی چھٹی کر دی تھی۔۔۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ مجھے ایک نیا وکاس دیا ہے
جوان لوگوں سے کہیں الگ تھا۔" [۵]

میٹرک کے بعد انہوں نے آرہ کے ہی ایک کالج "مہاراجہ کالج" میں داخلہ لیا شروع میں انہوں نے Science کی طرف رجوع کیا مگر جلد ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا کیونکہ وہ کیمسٹری، فزکس پڑھ کر ادب کی خدمت نہیں کر سکتے تھے اس کیلئے انہیں تاریخ اور ادب کی طرف راغب ہونا چاہیے تھا یہی وجہ ہے کہ Science کو خیر آباد کہہ کر وہ Arts کی طرف متوجہ ہو گئے اور تاریخ میں ایم_اے کی ڈگری حاصل کی انہوں نے بچپن سے ہی اپنی منزل کو آنکھوں میں بسا کے رکھا ہوا تھا اور بچپن سے ہی ادب کی خدمت کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

ذوقی کے علاوہ ان کے باقی بہن بھائیوں میں بھی لکھنے کا ہنر پایا جاتا ہے،"مشکور عالم بصیری" کا پورا گھرانہ ہی ادبی حوالے سے جانا جاتا ہے۔

ذوقی کے تین بھائی اور تین ہی بہنیں ہیں جن میں ذوقی کا پانچواں نمبر ہے ان کے بڑے بھائی "مسرور عالم" اردو کے بڑے انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں ان کی کتاب "شگّو کا ہوٹل" ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔
"نصرت جہاں" جو کہ ذوقی کی بہن ہیں اپنے کالج کے دنوں سے وہ بھی کہانیاں لکھا کرتی تھیں کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں، ان کے بعد ایک اور بہن "عصمت جہاں" ہیں وہ بھی افسانہ نگار ہیں ان کے بارے میں ذوقی بیان کرتے ہیں کہ

میری کہانیوں میں جو مضبوط عورتوں کے کردار آتے ہیں ان میں میری منجلی بہن کا بھی بہت عمل دخل ہے، ذوقی کو اس ادبی ماحول سے بہت فائدہ ہوا ذوقی کے ایک کامیاب فکشن نگار بننے کے پیچھے ان تمام افراد کا بھی ہاتھ ہے جن کا اثر وہ بچپن سے ہی لیتے رہے۔

۸ جولائی ۱۹۹۲ء میں ذوقی تبسم فاطمہ سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے جو ذوقی کے لئے ایک اچھی ساتھی اور شریک حیات کی صورت میں سامنے آئیں، ان کے کامیاب ادیب ہونے کے پیچھے تبسم فاطمہ کا بہت بڑا کردار رہا ہے کیونکہ وہ خود ایک اچھی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شاعرہ بھی ہیں، وہ جانتی تھیں کہ ایک ادیب کو کس طرح کا ماحول چاہیے ہوتا ہے لکھنے کے لیے، اس لیے ذوقی کے لکھنے لکھانے میں وہ کبھی بھی کوئی رکاوٹ نہیں آنے دیتیں اس بات کی گواہی ذوقی بھی دیتے ہیں۔

"تبسم نے مجھے صرف اور صرف لکھنے کے لیے مجبور کیا کہ تم لکھو تمہارا کام لکھنا ہے۔ بل کیسے بھرنا ہے، بینک کیسے جانا ہے، دنیا دیکھنی ہے، شادی بیاہ میں کس کو کیا دینا ہے، کیا نہیں دینا ہے، بچوں کی فیس کب جائے گی۔۔۔" [٦]

تبسم فاطمہ نے ہر اچھے برے وقت میں ذوقی کا ساتھ دیا ہے وہ ایک نسلی ہمسفر ہیں ذوقی اس کا اعتراف خود ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ

"میں اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہوں گا تبسم نہ ہوتی تو شاید میں نہ ہوتا"

مشرف عالم ذوقی کی دو اولادیں ہوئیں، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔
بیٹے کا نام ذوقی نے "عکاشہ عالم" رکھا جو کہ فلمی دنیا میں قدم رکھ چکے ہیں۔
۲۰۰۱ء میں اللہ تعالی نے ان کو اپنی رحمت سے نوازا جس کا نام انہوں نے "انعمتہ" رکھا مگر وہ دو سال تک زندہ رہ پائی، ذوقی کو اس معصوم سے بہت محبت تھی لکھتے ہیں۔

" ٦ مئی ۲۰۰۱ء کو ابا کا انتقال ہوا اور ٹھیک اس کے ١٦ دن بعد میرے صدمے کو کم

کرنے کے لئے، میری بٹیا اس دنیا میں آ گئی_ صحیفہ،انعمتہ دو نام رکھے بیٹی کے۔۔۔
لگا ابا کی واپسی ہو گئی ہے بٹیا میں۔۔۔٦ جولائی ۲۰۰۳ء کی صبح بٹیا نے بھی رخصت سفر
باندھ لیا۔۔۔" [۷]

۱۹۸۵ء میں ذوقی نے آرہ کو الوداع کہا اور دلی کو اپنا مسکن بنا لیا دلی آنے کے بعد انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، وہ اس بات سے اچھے سے واقف تھے کہ بڑے شہر میں اپنا نام بنانا بہت مشکل ہے مگر ذوقی نے ان مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، معاملاتِ زندگی چلانے کے لئے کچھ اخبارات سے منسلک ہوئے۔

دلی کے ادبی ماحول کے بارے میں ذوقی کی رائے کی عکاسی مندرجہ ذیل سطور سے کی جا سکتی ہے۔

"دلی آنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ادب ایک لمبی ریس کا نام ہے۔ یہاں رہنا ہے
تو ٹھہر کر مطالعہ کرنا ہوگا اور دنیا کے تمام علوم کو جاننے، سیکھنے پڑھنے کے بعد ہی اپنا ایک سفر
طے کرنا ہوگا۔ انہوں نے مطالعہ جاری رکھا اور کوشش کی کہ ادب کے لیے نئے نئے موضوعات
کا انتخاب کر سکیں۔" [۸]

دلی کے پروڈکشن ہاؤسز کے لیے انھوں نے اسکرپٹ لکھے بعد ازاں پروڈیوسر بن گئے، ڈائریکشن بھی کی یہ سلسلہ آج تک جاری ہے مگر اس سب کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبی دنیا کا سفر بھی جاری رکھا۔

جیسے کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ذوقی بچپن سے ہی ادب میں دلچسپی رکھتے تھے اس کا منہ بولتا ثبوت ان کی لکھی گئی پہلی کہانی ہے جو انہوں نے بچوں کے لئے لکھی۔

۱۷ سال کی عمر میں انہوں نے اپنا پہلا ناول "عقاب کی آنکھ" لکھا یہی نہیں بلکہ اس کے آس پاس کے عرصے میں وہ ناول "لمبئہ نمائندہ" بھی مکمل کر چکے تھے۔

پہلا افسانہ "جلتے جلتے دیپ" تھا جو انہوں نے ریڈیو کے لیے لکھا تھا، ذوقی نے تعلیم کے بعد صرف قلم کا ہی سہارا لیا ہے، اردو کے ساتھ ساتھ انہیں ہندی پر بھی عبور حاصل ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریریں صرف اردو تک محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے ہندی زبان کو بھی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

ذوقی نے ناول لکھے، افسانے بھی لکھے اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی، انہوں نے انسانی زندگی، سماجی مسائل، زندگی کی مصروفیات، سائنس، عورت کے مسائل، فسادات، سیاسی چال بازیاں، تقسیم، قدرتی آفات، انسانی قدروں کا زوال اور مشرق و مغرب کا تضاد جیسے مختلف موضوعات کو اپنی تحریروں میں اجاگر کیا ہے۔

ذوقی حساس طبیعت کے انسان ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والے ظلم اور زیادتی پر خاموش نہیں رہ پاتے انہوں نے جس ماحول میں پرورش پائی وہاں آئے دن ہندو مسلم فسادات سننے کو ملتے، بابری مسجد کا شہید ہونا،

گجرات کا زخم اور آرہ میں قیام کے دوران بچپن سے وہ جس طرح کے ماحول میں جی رہے تھے ان سب حالات نے ان کے مزاج پر گہرا اثر چھوڑا، جو کرب وہ بچپن سے جھیل رہے تھے وہ سارا غبار انہوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں نکالا، انہوں نے اپنے اردگرد کے مشاہدے کو کہانی کا روپ دے کر پیش کیا یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر کہانیوں میں غلامی، ہجرت، تقسیم، مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم اور تقسیم کے بعد ملک میں ہونے والی تبدیلیوں اور فرقہ وارانہ دنگوں کو زیر بحث لایا گیا ہے خاص طور پر مسلمانوں کے زوال کو دیکھ کر کُڑھتے رہتے ہیں۔ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

"ہمارا یعنی مسلمانوں کا مستقبل۔ جب بھی مسلمانوں کی بات کی جائے گی، عالمی سیاست کے افق روشن ہوں گے۔ اس وقت ایک پوری دنیا میری نگاہوں کے سامنے ہے اور شاید کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہو۔" [۹]

ذوقی چونکہ عملی زندگی میں صحافت سے منسلک ہیں اسی وجہ نے انہیں عوامی زندگی سے قریب کر دیا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کے کردار عام عوام میں سے لیے گئے ہیں انہوں نے ایک عام ہندوستانی کی کہانیوں کو زبان دی ہے۔ ان کی کہانیوں کے مطالعے سے ہندوستان میں پیش آنے والے آئے روز کے واقعات کی عکاسی ہوتی ہے ان کے سبھی ناول کسی نہ کسی سیاسی پسِ منظر میں لکھے گئے ہیں جس سے ان کی سیاست میں دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل میں سیاست میں قدم رکھنے کے خواہش مند ہیں۔

اس خواہش کا اظہار وہ اپنے ایک انٹرویو میں بھی کر چکے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

"اگر عام آدمی پارٹی، کانگریس، بی۔ جے۔ پی ایسا سوچتی ہے تو ضرور قبول کروں گا۔ میں سیاست میں آنا چاہتا ہوں۔" [۱۰]

وہ بچپن سے ہی مطالعہ کا شوق رکھتے تھے جب کبھی وہ کوئی ایسی کتاب پڑھتے جہاں حقیقت کو بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہوتا تو انہوں رونا آتا اور ان کے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کرتا کہ آخر لوگ جھوٹ کا سہارا کیوں لیتے ہیں انہوں نے بچپن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ کبھی بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیں گے جو کچھ ان کو نظر آئے گا وہی بیان کریں گے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حقیقت سے منہ چھپانے سے کبھی بھی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔

ذوقی کی شروعات کی کہانیوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بہار میں ہونے والے دنگے فسادات، ہنگامے اور دہشت صاف نظر آتی ہے جبکہ دلی ہجرت کرنے کے بعد انہیں جو ٹھوکریں کھانی پڑیں ان سب کی جھلک ذوقی کے افسانوی مجموعے "بھوکا ایتھوپیا" میں نظر آتی ہیں۔

ذوقی وسیع مطالعہ کے انسان ہیں وہ خاص طور پر روسی ادب کے مداح ہیں دلی آنے کے بعد انہوں نے بہت سے مصنفین کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا، نہ صرف مشرقی مصنفین بلکہ وہ مغرب سے زیادہ متاثر ہوئے۔
الکزینڈر پشکن ،نکولائی گوگول، فیودر دوستوفسکی ،لیوتالستائے، میخائل شولوخوف، چیخوف، موپساں، گبریل گارشیا مارکیز،میکسم گورکی اور ترگنیف وغیرہ اس کے مطالعہ کا حصہ رہے ہیں۔
مشرف عالم ذوقی عصرِ حاضر کے ایک نمایاں فکشن رائٹر ہیں ان کی تحریریں بے شک وہ افسانہ ہوں کہ ناول قارئین پر گہرا تاثر قائم کرتی ہیں انہوں نے کسی بھی موضوع پر جب بھی قلم اٹھایا تو ہمیشہ اسی کوشش کی تحت اٹھایا کہ تحریر میں مقصدیت اور جامعیت لازمی ہو۔
ذوقی کو اردو افسانے میں زیادہ شہرت ملی ان کے بہت سے افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں اور اپنی الگ پہچان بنا چکے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ قلم کی مزدوری کرتے ہیں وہ ایسے لکھتے ہیں جیسے ایماندار مزدور اپنی مزدوری کرتا ہے آج وہ اردو ادب میں اسی قلم مزدوری کی بدولت ہی اپنا خاص مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔
ذوقی کی تحریروں میں یکسانیت نہیں نظر آتی ہیں ان کی تحریریں مختلف موضوعات کا ذخیرہ ہوتی ہیں، انہوں نے اپنی تحریروں کے لئے سادہ زبان و بیان کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ ان کا اسلوب سادہ ہے، وہ ہر خاص و عام قاری تک اپنی تحریر کی رسائی چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں پیچیدگی بہت کم نظر آتی ہے۔
ایک وقت تھا جب ذوقی کی تحریروں سے ترقی پسندی کا گمان ہوتا تھا اور وہ خود بھی اس بات کو مانتے ہیں کہ وہ ایک وقت میں ترقی پسند خیالات کے مالک تھے پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں احساس ہو گیا کہ آزاد فضا میں سانس لینا اور نئی روایت قائم کرنا وقت کی ضرورت ہے۔
ان کی تحریروں کے مطالعے سے کوئی ایک تحریر بھی ایسی سامنے نہیں آتی جس میں سماجی حقیقتوں کو پیش نہ کیا گیا ہو۔
ذوقی نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شاعری سے کی تھی بچپن میں ان کو جیسا ماحول ملا اس کے زیرِ اثر وہ شعر پڑھا کرتے تھے بلکہ گنگنایا بھی کرتے تھے وہ اکثر میر، غالب اور ذوق کے اشعار گنگنایا کرتے تھے خاص کر ذوق سے انہیں قلبی لگاؤ محسوس ہوتا تھا اور اسی لگاؤ نے انہیں "مشرف عالم" سے "مشرف عالم ذوقی" بنا دیا۔
خود بیان کرتے ہیں کہ

> "پتہ نہیں کیا ہوا کے ذوق سے میں نے ایک قلبی لگاؤ محسوس کیا۔ مجھے یاد ہے۔ایک چھوٹی سی بچوں والی سائیکل ہوا کرتی تھی۔ میں آنگن میں سائیکل چلاتا ہوا غالب اور اقبال کو بھول کر ذوق کا کلام گنگنانے لگا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ایک دن ابا حضور نے کا ... یہ تو ذوقی ہے۔

بس صاحب اسی دن سے میں مشرف عالم ذوقی ہو گیا۔" [۱۱]

ذوقی نے بہت سی نظمیں لکھیں مگر شائع کم کروائیں، اپنی شاعری کے شوق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"میں اچھی شاعری کا عاشق ہوں۔ شروعات شاعری سے ہوئی لیکن مجھے جلدی اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں یا ادب کو دینا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے شاعری سے الگ میدان منتخب کرنا ہوگا۔" [۱۲]

ذوقی کے ناولوں میں سیاست کو بھی موضوع بنایا جاتا رہا ہے جس پر اکثر لوگ ان کو تنقید کا نشانہ بھی بناتے رہے مگر انہوں نے اپنے انٹرویو میں ان سب کے منہ بند کر دیے۔

ملاحظہ کیجئے۔

"دنیا کے تمام بڑے ناول پڑھ جایئے آپ کو سیاست کا غلبہ صاف نظر آئے گا۔ سروانٹس کے ناول ڈان کیز وٹ کو لیجئے، سارت، مارکیز، ملان کندیرا، نجیب محفوظ، اوہان پامک، سلمان رشدی جس کو چاہیے، پڑھ لیجئے۔ ایک بات سن لیجئے۔۔۔اور آپ کی بات پر حیران ہوں کہ ہمارے بلند قارمت، سیاست کو ادب کا حصہ نہیں مانتے۔" [۱۳]

ذوق نے عصرِ حاضر کے تمام ادیبوں کا مطالعہ کیا ہے مگر وہ سب سے زیادہ متاثر مستنصر حسین تارڑ سے ہیں، ان کی اکثر تحریروں میں تارڑ کے لیے تعریفی کلمات سننے کو ملتے ہیں۔

اسد محمد خان، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، مبین مرزا، آصف فرخی، حمید شاہد، طاہرہ اقبال، اقبال خورشید اور اخلاق احمد پاکستانی مصنفین ہیں جن کے کام سے وہ متاثر ہوئے جبکہ ہندوستان میں وہ جوگندر پال اور رتن سنگھ کو پسندیدہ کہتے ہیں لکھتے ہیں کہ

"میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ان میں سے ہر کسی کے پاس دو ایک عمدہ مثال ضرور ہیں۔ رہی اثرات کی بات، تو میں جلد کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہاں میرا آئیڈیل روسی افسانہ نگار دوستوفسکی ہے۔" [۱۴]

ذوقی نے افسانہ اور ناول میں اپنی الگ پہچان بنالی ہے۔

عصرِ حاضر کے بہترین فکشن نگاروں میں شامل ہونے والے مشرف عالم ذوقی کا تخلیقی سفر ابھی بھی جاری ہے، وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں مزید پختگی آتی جارہی ہے۔

تصانیف

مشرف عالم ذوقی Journalism سے منسلک ہیں ۱۹۸۷ء میں دلی کی زمین پر قدم رکھتے ہی ان کے لیے الیکٹرونک میڈیا کے دروازے کھل گئے، دوسال تک اُنھوں نے دلی کے کئی فلم سکرپٹ بھی لکھے اور ۱۹۸۹ء میں پرڈویوسر بن گئے انہوں نے ڈائرکشن کی، پروگرام بنائے، سکرپٹ بھی لکھے اور ساتھ میں ادبی سفر بھی جاری رکھا جو آج کل تک جاری ہے۔

الیکٹرونک میڈیا سے جب ان کی وابستگی ہوئی اس وقت ڈاکومنیٹری فلم، ڈاکومینٹری ڈرامہ کی طرز کے پروگرام بنائے جاتے تھے ذوقی نے بھی اس پیش رفت کو قبول کیا اور شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے کوئی ڈاکومینٹری نہ بنائی ہو۔

ہندی اور اُردو کے باون قلمکاروں پر انہوں نے ڈاکومینٹری فلمز بنائیں جس کے اسکرپٹ وہ خود لکھا کرتے اور تحقیق کا سب کام بھی خود انجام دیا کرتے۔

قراۃ العین حیدر، نامور سنگھ، راجندر یادو، جوگندر پال اور ڈاکٹر محمد حسن پر ڈاکومنیٹری فلمز بنا چکے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

ان کی کہانیوں پر ٹیلی فلمز بھی بن چکی ہیں، بہت سی کہانیوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ بھی کیا ہے، بچوں کے لیے بھی لکھا، تنقید کی دنیا میں بھی قدم رکھا۔ ان کے لکھے ڈراموں کو سٹیج پر پیش کیا جاتا رہا۔

ذوقی کے ناول اور افسانوں نے آج کے تیز دور میں بھی اپنی جگہ بنائی ہے ادبی دنیا میں آج ان کے ناولوں کی دھوم ہے۔

ان کی لکھی کہانیاں قاری کو بے چین کر دیتی ہیں، ذوقی نے زیادہ سے زیادہ کوشش کی کہ نئی نسل کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کر سکیں اور وہ کافی حد تک اس میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔

ذوقی کا تخلیقی سفر طویل ہے انہیں اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی پر بھی عبور حاصل ہے انہوں نے دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، آج وہ ہندی اور اُردو ادب دونوں میں اپنی ایک الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ناول

اردو ناول

۱ ۔ عقاب کی آنکھیں	(عالمی میڈیا لمیٹڈ، دہلی)	۱۹۷۹ء
۲ ۔ نیلام گھر	(تخلیق کار پبلیشرز، دہلی)	۱۹۸۵ء
۳ ۔ شہر چُپ ہے	ایضاً	۱۹۸۸ء
۴ ۔ ذبح	ایضاً	۱۹۹۰ء
۵ ۔ مسلمان	(اردو بک کارنر، دہلی)	۱۹۹۲ء
۶ ۔ بیان	(تخلیق کار پبلیکیشنز، دہلی)	۱۹۹۵ء
۷ ۔ پوکے مان کی دنیا	ایضاً	۲۰۰۴ء
۸ ۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان	ایضاً	۲۰۰۵ء
۹ ۔ لے سانس بھی آہستہ	ایضاً	۲۰۰۸ء
۱۰ ۔ آتش رفتہ کا سُراغ	ایضاً	۲۰۱۳ء
۱۱ ۔ نالۂ شب گیر	(ذوقی پبلیشرز، دہلی)	۲۰۱۵ء
۱۲ ۔ مرگ انبوہ	(ایجوکیشنل پبلشنگ، دہلی)	۲۰۱۹ء

ہندی ناول

۱ ۔ مسلمان	(اندر پرستھ پرکاشن، دہلی)	۱۹۹۰ء
۲ ۔ بیان	(ساشا پبلیکیشنز، دہلی)	۱۹۹۸ء
۳ ۔ پوکے مان کی دنیا	(شیلنائن، دہلی)	۲۰۰۶ء
۴ ۔ نیلام گھر	(نمن پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۷ء
۵ ۔ شہر چُپ ہے	(بھاؤنا پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۷ء
۶ ۔ سب سازندے	(ساشا پبلیکیشنز، دہلی)	۲۰۰۸ء
۷ ۔ ذبح	(بھاؤنا پرکاش، دہلی)	۲۰۰۸ء
۸ ۔ سنامی میں وِیچینا	(سنکلین پبلیشرز، دہلی)	۲۰۰۹ء

۹ ۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان	(سائیٹک پرکاشن، دہلی)	۲۰۱۰ء
۱۰ ۔ ایک چاندانی رات ہوا کرتی تھی	ندارد	۲۰۱۶ء

افسانوی مجموعے

اردو افسانوی مجموعے

۱ ۔ بھوکا ایتھوپیا	(تخلیق کار پبلیشر ز، دہلی)	۱۹۹۲ء
۲ ۔ منڈی	ایضاً	۱۹۹۸ء
۳ ۔ غلام بخش	ایضاً	۱۹۹۹ء
۴ ۔ صدیوں کو الودع کہتے ہوئے	(ساشا پبلیکشنز، دہلی)	۲۰۰۰ء
۵ ۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	(ایجوکیشنل پبلیشنگ، دہلی)	۲۰۰۲ء
۶ ۔ ایک انجان خوف کی رہرسل	ایضاً	۲۰۱۰ء
۷ ۔ جدید ہندی کہانیاں	(نیشنل بک ٹرسٹ، دہلی)	س.ن
۸ ۔ نفرت کے دنوں میں	(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)	۲۰۱۳ء

ہندی افسانوی مجموعے

۱ ۔ بھوکا ایتھوپیا	(تخلیق کار پبلشرز، دہلی)	۱۹۸۵ء
۲ ۔ غلام بخش	(جن وانی پرکاشن، دہلی)	۱۹۹۴ء
۳ ۔ فرشتے بھی مرتے ہیں	ایضاً	۱۹۹۴ء
۴ ۔ ذوقی کی سریسٹھ کہانیاں	ندارد	۲۰۰۰ء
۵ ۔ ذوقی کی حسیت کہانیاں	(آلیکھ، دہلی)	۲۰۰۰ء
۶ ۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)	۲۰۰۴ء
۷ ۔ فزکس، کیمسٹری، الجبرا	(جن وانی پرکاش، دہلی)	۲۰۰۵ء
۸ ۔ ورین ہسٹنگ کی ٹوپی	ندارد	۲۰۰۶ء
۹ ۔ لیباٹری	(کانفلوٹمنسن انٹرنیشنل، دہلی)	۲۰۰۶ء
۱۰ ۔ صدی کو الودع کہتے ہوئے	(ساشا پبلیکیشنز، دہلی)	۲۰۰۶ء

۱۱ ۔ بازار کی ایک رات	ندارد	۲۰۰۸ء
۱۲ ۔ امام بخاری کا نیپکن	(پین گوئن، دہلی)	۲۰۰۹ء
۱۳ ۔ من روسا لگ رام	ندارد	۲۰۰۹ء
۱۴ ۔ فرج میں عورت	(گیان پیٹھ، دہلی)	۲۰۱۰ء
۱۵ ۔ ذوقی کی منتوع کہانیاں	(نمن پرکاشن، دہلی)	س.ن
۱۶ ۔ شاہی گلدان	(اردو پرکاشن، دہلی)	۲۰۱۱ء
۱۷ ۔ سُرخ بستی	(اندر پرست پرکاشن، دہلی)	س.ن

تنقیدی کتب

۱ ۔ نئی بستی میں ادب	ندارد	۲۰۰۰ء
۲ ۔ بلونت سنگھ کی کہانیاں	(جن وانی پبلیشرز، دہلی)	۲۰۰۰ء
۳ ۔ اپنا آنگن	(بھاؤنا پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۷ء
۴ ۔ اُردو ادب	ایضاً	س.ن
۵ ۔ مکالمہ کے سات رنگ	ایضاً	س.ن
۶ ۔ اُردو ساہتیہ سمواد کے سات رنگ	(جن وانی پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۷ء
۷ ۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اُردو افسانہ	ندارد	س.ن
۸ ۔ اُردو جگت	(بھاؤنا پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۸ء
۹ ۔ باادب باملاحظہ ہوشیار	ندارد	۲۰۰۸ء
۱۰ ۔ آب روان کبیر	(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)	۲۰۱۳ء
۱۱ ۔ سلسلہ شب و روز	(ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی)	۲۰۱۴ء

تالیفات

۱ ۔ سرخ بستی (دو حصے)	(جن وانی پرکاشن، دہلی)	۱۹۹۳ء
۲ ۔ وبھاجن کی کہانیاں	ایضاً	۲۰۰۰ء
۳ ۔ منٹو پر آٹھ کتابیں	ایضاً	۲۰۰۴ء
۴ ۔ [illegible]	[illegible]	[illegible]

۵ ۔ بیدی کی منتخب کہانیاں	ایضاً	۲۰۰۴ء
۶ ۔ جوگندر پال کی منتخب کہانیاں	ایضاً	۲۰۰۴ء
۷ ۔ احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیاں	ایضاً	۲۰۰۴ء
۸ ۔ مسلم باغی عورتوں کی کتھا	(راجکمل، دہلی)	۲۰۰۵ء
۹ ۔ احمد فراز کی منتخب شاعری	(جن وانی پرکاشن، دہلی)	۲۰۰۶ء
۱۰ ۔ ہنس کا مسلمان نمبر	ایضاً	۲۰۰۰ء
۱۱ ۔ اُداس نسلیں	ایضاً	۲۰۰۲ء
۱۲ ۔ تقسیم کی کہانیاں	(جن وانی پرکاشن، دہلی)	س.ن
۱۳ ۔ جدید اردو افسانے	(نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا)	۲۰۰۸ء

ڈرامے

۱ ۔ چار ڈرامے	ندارد	۲۰۰۰ء
۲ ۔ گڈ بائے راجنیتی	(ساشا پبلی کیشنز، دہلی)	۲۰۰۵ء
۳ ۔ ایک سڑک ایودھیا تک	(جن وانی پبلی کیشنز، دہلی)	۲۰۰۵ء
۴ ۔ آخری بیان	ندارد	۲۰۰۶ء

☆ وہ ڈرامے جو اسٹیج پر دکھائے گئے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱ ۔ بیان

۲ ۔ سب سے اچھا انسان

۳ ۔ ایک ہارے ہوئے انسان کا کنفیشن

۴ ۔ ایک اور شہادت

ٹی، وی سیریل

۱ ۔ آبروئے غزل	(۱۵۲ اقساط پر مشتمل ہے)
۲ ۔ عکس پس عکس	(۱۲۶ اقساط پر مشتمل ہے)
۳ ۔ ورق ورق چہرہ	(۲۶ اقساط پر مشتمل ہے)
۴ ۔ [illegible]	([illegible] اقساط پر مشتمل ہے)

۵ ۔ مِلّت	(ذوقی کے اپنے ناول ''مسلمان'' سے ماخوذ ہے۔)
۶ ۔ رنجشیں	(ذوقی کی کہانی ''ایک نیا موڑ'' سے ماخوذ ہے)
۷ ۔ بے جڑ کے پرندے	(۱۲۶اقساط پر مشتمل ہے URDUE.TV، پر پیش کیا گیا)
۸ ۔ دوسرا رُخ	(۱۲۶اقساط پر مشتمل ہے۔)
۹ ۔ کتابوں کے رنگ	(۱۲۶اقساط پر مشتمل ہے URDUE.TV، پر پیش کیا گیا)
۱۰ ۔ نشیمن	(۱۶اقساط پر مشتمل ہے،1D.D پر پیش کیا گیا)
۱۱ ۔ساتواں سورج	(۱۷اقساط پر مشتمل ہے،1D.D پر پیش کیا گیا)
۱۲ ۔ تلاش	(۱۵اقساط پر مشتمل ہے کشمیر چینل پر پیش کیا گیا ہے)
۱۳ ۔ رات چاند اور چور	(۱۸اقساط پر مشتمل ہے۔)
۱۴ ۔ مورچہ	(جموّں دوردرشن پر پیش کیا گیا ہے۔)
۱۵ ۔ آنگن کی دھوپ	(ذوقی کی کہانی ''بوڑھے بھاگ سکتے ہیں'' سے ماخوذ ہے۔)
۱۶ ۔کشمیر سچائی کے روبہ رو	(۱۵اقساط پر مشتمل ہے۔)
۱۷ ۔ نئی صبح کے لیے	(۱۶اقساط پر مشتمل ہے۔)
۱۸ ۔ چوک	(۱۵اقساط پر مشتمل ہے۔)
۱۹ ۔ اک نئی صبح	ندارد
۲۰ ۔ مذہب نہیں سکھاتا	(مجموعہ ''بھوکا ایتھوپیا'' سے ماخوذ ہے۔)
۲۱ ۔ مقدمہ	(۱۶اقساط پر مشتمل ہے۔)
۲۲ ۔ اُلجھن	ندارد
۲۳ ۔ اکیسویں صدی کے بچے	(۱۵اقساط پر مشتمل ہے۔)
۲۴ ۔ عجیب داستان ہے یہ	(۱۳۱اقساط پر مشتمل ہے، ریڈیو کے لیے)
۲۵ ۔ آزمائش	(۱۵اقساط پر مشتمل ہے .ڈی،ڈی، کشمیر پر پیش کیا

گیا۔)

۲۶ ۔ سمال اسکیل انڈسٹریز آف یو پی (۱۵اقساط پر مشتمل ہے الیکٹرونک میڈیا پر پیش کیا گیا)

۲۷ ۔ پروگرام آن کلد یپ نائیر ندارد

۲۸ ۔ خواجہ میر درد سے خواجہ (۳۰ منٹ کا پروگرام صوفی چینل کے لیے پیش کیا گیا ہے۔)

۲۹ ۔ سپورٹس ارتھ سائنس ندارد

ٹیلی فلمیں

۱ ۔ پربت (۴۵منٹس پر مشتمل ہے۔)

۲ ۔ دکھاوہ ،دورنگ (۳۰منٹس پر مشتمل ہے۔)

۳ ۔ انجام (ایک گھنٹے پر مشتمل ہے۔)

۴ ۔ رکا ہوادرد (ایک گھنٹے پر مشتمل ہے۔)

۵ ۔نسین (۳۰منٹس پر مشتمل ہے۔)

۶ ۔ سورج کا سفر (۳۰منٹس پر مشتمل ہے۔)

۷ ۔ بندش (۳۰منٹس پر مشتمل ہے۔)

۸ ۔ سنگھرس (۳۰منٹس پر مشتمل ہے۔)

Documentries as Director

۱ ۔ Institution of dehli

۲ ۔ باپو کے سپنوں کا شہر

۳ ۔ یہی ہے کشمیر

۴ ۔ نیشنل اسکول آف ڈرامہ National school of drama.

۵ ۔ بابری مسجد،ایک سچائی یہ بھی

۶ ۔ وایومنڈل میں پھیلا زہر

۷ ۔ ساہتیہ اکیڈمی

اعزازات

حکومتیں اور مختلف تنظمیں فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں مختلف، اعزازات سے نوازتی ہے۔
مشرف عالم ذوقی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں مختلف ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

١ ۔ کرشن چندر ایوارڈ		١٩٩٦ء
٢ ۔ کتھا ایورڈ		١٩٩٧ء
٣ ۔ الیکٹرونک میڈیا ایوارڈ	(پروفیسر ایس کی عجیب داستان پر ملا)	١٩٩٩ء
٤ ۔ ملینیم ایوارڈ	(بہترین فکشن نگار جامع اُردو علی گڑھ)	٢٠٠٠ء
٥ ۔ سرسید نیشنل ایوارڈ	(بہترین فکشن نگار)	٢٠٠٣ء
٦ ۔ اُردو اکیڈمی بک ایوارڈ		٢٠٠٥ء
٧ ۔ بہار اُردو اکیڈمی ایوارڈ فار ناول		٢٠٠٥ء
٨ ۔ انٹرنیشنل ہیومن رائٹس پروٹکشن ایسویشن ایوارڈ		٢٠٠٧ء
٩ ۔ اُردو اکیڈمی دہلی ایوارڈ		٢٠٠٦ء
١٠۔ اردو اکیڈمی تخلیق نثر ایوارڈ دہلی		٢٠٠٧ء
١١ ۔ فروغ اُردو دوحہ قطر انعام		٢٠١٥ء
١٢ ۔ سہیل عظیم آبادی انعام بہار اُردو اکادمی		٢٠١٥ء

حوالہ جات

۱۔ ماہنامہ چہار سو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری فروری ۲۰۱۷ء، ص:۶

۲۔ شیخ لطیف، مشرف عالم ذوقی کی ہندی کہانیوں میں سمپر دا یکتہ، پی۔ایچ۔ڈی تھیسس، ص:۸

۳۔ مشرف عالم ذوقی، سلسلہ شب وروز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۴۳۶

۴۔ ایضاً، میرا تخلیقی سفر، عالمی جائزہ، مدیر عبدالرحمن ایڈوکیٹ، شمارہ جنوری فروری، ص:۱۳

۵۔ شیخ لطیف، مشرف عالم ذوقی کی ہندی کہانیوں میں سمپر دا یکتہ، پی۔ایچ۔ڈی تھیسس، ص:۱۵

۶۔ ایضاً، ص:۱۳

۷۔ مشرف عالم ذوقی، سلسلہ شب وروز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص:۴۳۷

۸۔ سمیہ بشیر، ذوقی کی ادبی خدمات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص:۱۳

۹۔ گلزار جاوید، مشرف عالم ذوقی (انٹرویو)، ماہنامہ چہار سو، راولپنڈی، جنوری فروری ۲۰۱۷ء، ص:۱۶

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۸ (اینکر کی طرف سے سوال کیا گیا کہ آپ کو کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے الیکشن ٹکٹ کی پیشکش کی جائے تو آپ قبول کریں گے؟)

۱۱۔ ایضاً، ص:۸

۱۲۔ مشرف عالم ذوقی، سلسلہ شب وروز، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴، ص:۱۴۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۵

۱۴۔ ایضاً، ص:۱۲

باب دوم :

اکیسویں صدی میں ناول نگاری کا مختصر جائزہ

اکیسویں صدی میں ناول نگاری کا مختصر جائزہ

ناول قصہ کہنے کا فن ہے، یہ زندگی کو تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کے فن کا نام ہے جس کا مقصد معاشرتی تبدیلیوں، واقعات ومعاملات کو پیش کرنا ہوتا ہے جس طرح زندگی میں آئے روز تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں ایسے ہی ناول کے موضوعات میں بھی تبدیلی کا عمل دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ ناول ادب کی ایک وسیع صنف ہو جس میں زندگی کے تمام معاملات ومسائل رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آل احمد سرور ناول کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ناول انگریزی کا لفظ۔انگریزی اثر کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔ "[۱]

اُردو ادب میں ناول کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، یہ صنف ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جہاں ناول نگار اپنی خواہش کے مطابق کوئی تخیلی دینا نہیں قائم کرتا بلکہ وہ ایک عام انسان کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے جہاں دُکھ بھی ہوتے ہیں اور سُکھ بھی، ناول کی کہانی روزمرہ کی زندگی کی بنیاد پر بنی جاتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء سے تا حال اُردو ناول کی عمر کم وبیش تقریباً ایک سو پچتالیس سال ہو چکی ہے اتنے طویل عرصے میں کوئی بھی صنفِ ادب بلوغت سے ہمکنار ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اُردو ناول کے ارتقائی سفر کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر ضروری ہے جو اُردو ناول کے موجد گردانے جاتے ہیں اُنہوں نے اصلاحی ناول لکھے جن میں بچوں اور خوتین کی تعلیم کے لیے ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جا سکتا، نذیر احمد کے بعد کے ناول نگاروں نے زیادہ تر معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ گفتگو بنا کر ناول نگاری کی صنف کو فروغ دیا۔

آزادی کے بعد تین دہائیوں تک لکھے جانے والے ناولوں میں جا بجا، ہجرت، فسادات، ناسٹالجیا، تقسیم کے اثرات اور تقسیم کے بعد پیش آنے والی معاشی سماجی اور سیاسی صورتحال کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے، تخلیق کار کو ذہنی طور پر جتنی بھی آسودگی حاصل کیوں نہ ہو وہ اِردگرد کے حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

برصغیر کے لوگوں کو نہ صرف تقسیم کا درد سہنا پڑا بلکہ اس کے نتیجے میں پیش آنے والے حادثات میں بہت سے اپنوں کو بھی گنوا دیا، اسی پہ بس نہیں بلکہ کچھ عرصے بعد ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کا قیام ان سب واقعات نے ہندوستان اور پاکستان کی عوام کے ذہن میں عجیب کشمکش ڈال دی جوان کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کا سبب بنی۔

ادب کی کوئی بھی صنف ایسی نہیں جس میں بدلتے ہوئے حالات، واقعات اور تجربات ومشاہدات کو بیان نہ کیا گیا ہو، انسانی زندگی ہر لمحہ تغیر وتبدل کا شکار رہی ہے کبھی یہ خاموش ہوتی ہے، تو کبھی ہنگاموں سے بھر پور، کبھی رومانی ہوتی ہے، کبھی آشوب زمانہ سے بھری ہوئی، ایسے ہی جب ہم اُردو ناول کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ابتداء سے لے کر اب تک کی بدلتی ہوئی اقدار، سیاسی شعور اور سماجی رسم ورواج اپنی شکل میں موجود رہا ہے۔

ابتداء سے اب تک اُردو ناول کی تاریخ میں بے شمار ناول لکھے گئے ہیں جنہوں نے ناول کی تاریخ میں اپنی جگہ بنائی مگر اس مقالہ میں میرا مقصود اکیسویں صدی کے ناول نگاروں کا مختصر جائزہ لینا ہے۔

اکیسویں صدی میں ناول نے کروٹ لی ہے مگر ناول کے پس منظر میں کچھ سوالات اور مسائل کا اضافہ بھی دیکھنے میں آیا ہے مگر خوش آئند بات یہ ہے کہ آج کا ناول نگار سماجی وسیاسی زندگی کی تفہیم کی کوشش میں سرگرداں ہے اور نئے ناول نگاروں میں سے کچھ کے ناولوں کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُردو ناول اپنی فنی ناقص کمزوریوں کو پسِ پشت ڈال کر اب آگے بڑھ رہا ہے جس سے ناول کی صنف کو مزید وسعت ملنے کے امکانات روشن ہو رہے ہیں۔

اکیسویں صدی کی ابتداء میں ہی علی امام نقوی کا ناول ''بساط'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا جس میں مسئلہ کشمیر کو موضوع بنا کر ہندوستانی اور پاکستانی سیاست کا گھناؤنا چہرہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس ناول کو نئی صدی کی شروعات میں ایک نئی کوشش کہا گیا ہے، اس ناول کی اہم خوبی یہ گردانی جاتی ہے کہ اس میں علی امام نقوی نے بمبئی کی ادبی روایت کا نقشہ کھینچا ہے۔

نئی صدی کی ابتداء میں ہی غضنفر علی (جو کہ ادب میں غضنفر کے نام سے مشہور ہیں) کا ناول ''دویہ بانی'' منظر عام پر آیا جو ان کے سابقہ ناولوں سے موضوع، زبان وبیان اور قصے کہ گہرائی کے لحاظ سے بہت مختلف تھا جس میں انہوں نے ہندوستانی معاشرے کا نقشہ کھینچتے ہوئے دلت سماج کا پس منظر نامہ پیش کیا۔ ہندوستان میں صدیوں سے ہونے والے ذات پات کے فرق کی وضاحت ہمیں اس ناول کے مطالعے سے مل جاتی ہے۔

۲۰۰۳ء میں ان کو ایک اور ناول ''فسوں'' شائع ہوا جو زیادہ اہمیت نہ حاصل کر پایا، ۲۰۰۴ء میں ''وش منتھن'' ۲۰۰۸ء میں ''شوراب'' اور ۲۰۱۱ء میں ''مانجھی'' کے نام سے ان کے ناول منظر عام پر آئے جن میں سے ''مانجھی'' قدرے بہتر ثابت ہوا اور لوگوں کی توجہ اپنے طرف مبذول کروانے میں کامیاب ہوسکا۔

شمس الرحمٰن فاروقی اُردو ادب میں نقاد اور محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' منظرِ عام پر آیا جس کے بارے میں بیشتر محققین کی مشترکہ رائے ہے کہ اس ناول کی مرکزی کردار وزیر

بیگم درحقیقت نواب مرزاداغ دہلوی کی والدہ کا کردار ہے، یہ ناول ایک تاریخی ناول ہے اور چونکہ اُردو کی روایت میں تاریخی ناولوں کو پہلے بھی اہمیت دی جاتی رہی ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ فاروقی صاحب نے اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اس ناول میں کے توسط سے آج کا قاری نواب مرزاداغ دہلوی کی زندگی کے نشیب وفراز سے آگاہی حاصل کرسکتا ہے۔

اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ایک بڑا نام مستنصر حسین تارڑ کا ہے جنہوں نے ناول کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے کا تجربہ کیا انہوں نے تہذیبی، معاشی، سیاسی وسماجی معاملات کو رومانوی احساس میں رنگ کر اردو ناول کے دامن میں وسعت پیدا کردی ہے۔ ۲۰۰۱ء میں ان کا ناول ''قربت مرگ میں محبت'' منظر عام پر آیا جبکہ ''قلعہ جنگی'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جو افغانستان کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے، نئ صدی میں وہ تخلیقی طور پر بہت فعال نظر آرہے ہیں۔

۲۰۰۵ء میں انہوں نے ''ڈاکیا اور جولاہا'' لکھا جو کہ ایک علامتی ناول ہے اس ناول میں انہوں نے ''پروین شاکر'' کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے ان کی مرحوم شاعرہ سے دلی وابستگی کا اظہار ہوتا ہے اِس ناول کے بعد ۲۰۱۰ء میں ان کا ناول ''خس وخاشاک زمانے'' شائع ہوا جس میں انہوں نے ۱۹۲۰ء کی دہائی کے پنجاب کے دیہاتوں کا نقشہ کھینچا ہے اور تقسیم سے قبل کے ہندو مسلم اتحاد کی مثالیں بھی اس ناول میں دیکھنے کوملتی ہیں۔

حسن منظر بنیادی طور پر افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں مگر گزشتہ برسوں میں ان کے چار ناول شائع ہوئے جس سے انہوں نے خود کو ایک اچھے ناول نگار کے طور پر بھی منوالیا ہے، ۲۰۰۶ء میں ان کا پہلا ناول ''العاصفہ'' منظر عام پر آیا جسے عرب کی معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی پر لکھا گیا، یہ ناول ایک غیر کلچر کو روشناس کرواتا ہے، اس ناول کے بعد دو ناول ''حبس'' اور ''دھنی بخش کے بیٹے'' منظر عام پر آئے، ''دھنی بخش کے بیٹے'' ۲۰۰۸ء جبکہ ''حبس'' ۲۰۱۶ء میں شائع ہوا۔

اکیسویں صدی میں اُردو نال کی روایت ایک نام کے بغیر ادھوری ہے جو کہ مرزا اطہر بیگ ہیں۔

مرزا اطہر بیگ کا پہلا ناول ''غلام باغ'' ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا جو کہ اُردو ناول کی تاریخ میں اچھا اضافہ ثابت ہوا اس ناول میں انہوں نے سماجی وتہذیبی زندگی کو موضوعِ گفتگو بنایا ہے، ان کا یہ ناول ایک وسیع موضوعاتی ناول ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے حوالے سے اپنی رائے مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں۔

"اس ناول کے ضمن میں ایبر ڈٹی کے حوالے سے ان نکتے کو نہ فراموش کیا جائے گا
کہ نوآبادیاتی دور سے قبل نیز نوآبادیاتی دور کے بعد ہمارا منظرنامہ جنون، پاگل پن،

ہر معاملے میں انتہا پسندی، عدم برداشت، فضول کی جنگوں، نفرتوں، تعصّبات اور ہمہ گیر انتشار سے عبارت رہا ہے اور آج کے دور کا جنون تو سب پر بازی لے گیا ہے کہ بقا کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ "[۲]

۲۰۰۹ء میں ان کا دوسرا ناول ''صفر سے ایک تک'' شائع ہوا جو کہ سائبر اسپیس اور اس کے خاص لوازمات سے در آنے والی تبدیلیوں کا احوال بیان کرتا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کے زیرِ بحث دونوں نالوں میں مماثلت دیکھنے میں آتی ہے۔ اس حوالے سے امجد طفیل کی مندرجہ ذیل آراء ملاخطہ کریں۔

"مرزا اطہر بیگ کے دونوں ناول اپنے اندر کئی مماثلتیں رکھتے ہیں۔ اس ناول میں۔۔۔ زلیخا، زہرہ کی چھوٹی بہن محسوس ہوتی ہے اور ذکاءاللہ غُلام باغ کے ہیرو کی ایک اور شکل ''صفر سے ایک تک'' پر غلام باغ کے سائے بہت گہرے ہیں، مگر اس کے باوجود یہ دونوں ناول اپنی اپنی جگہ پر نہایت کامیاب ہیں۔ "[۳]

زیر بحث دونوں ناولوں کی کامیابی کے بعد مرزا اطہر بیگ کا نیا ناول ''حسن کی صورتحال: خالی جگہ پُر کرو'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہوا۔ مجموعی طور پر اپنے ناولوں کے دیرپا اثر اور اچھوتے موضوعات کے سبب مرزا اطہر بیگ کا شمار اکیسویں صدی کے صفِ اول کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر کے ہندوستانی فکشن نگاروں میں ایک نام سید محمد اشرف کا ہے جو اپنے ناول ''نمبر دار کا نیلا'' کی وجہ سے ناول نگاروں میں شامل ہو چکے ہیں، ۲۰۱۶ء میں ان کا ناول ''آخری سورایاں'' منظرِ عام پر آیا جو مغلیہ تہذیب کے تناظر میں لکھا گیا اور انداز بیانیہ اپنایا گیا ہے ناول میں مصنف مغلیہ تہذیب کی مختلف چیزوں، علوم وفنون اور روایات کو مختلف سورایوں پر رخصت کرتا ہوا نظر آتا ہے، اس ناول کی ایک خاص بات یہ کہ سید محمد اشرف نے واقعات کو اس خوبصورتی سے جذب کر دیا ہے کہ قاری کو سب آنکھوں دیکھا معلوم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری کو اس ناول میں دلچسپی پیدا ہوئی، اکیسویں صدی کے نمایاں ناولوں میں سید محمد اشرف کا یہ ناول بھی نمایاں ہے۔

نئی صدی میں ایک اہم اضافہ پروفیسر محمد حسن کا ناول ''غمِ دل وحشت دل'' بھی ہے جو ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آیا، درحقیقت پروفیسر محمد حسن نقاد، ڈرامہ نویس اور دانشور کے طور پر جانے جاتے ہیں مگر اس ناول کے ذریعے انہوں نے ناول کی دنیا میں بھی قدم رکھ دیا ہے۔ یہ ناول درحقیقت سوانحی ناول ہے جس میں ایک قوم کی تہذیبی وسماجی تاریخ سمٹ آتی ہے۔

انور پاشا نے چند خوبصورت الفاظ کا استعمال کر کے اس ناول پر اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں ملاخط کریں۔

"غرض کے محمد حسن کا ناول ''غمِ دل وحشتِ دل'' ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جہاں ہر طرف تماشائے شکستِ خواب کے نظائے بکھرے ہوئے ہیں۔لیکن شکستِ خواب کے جلو میں تجدید خواب کے اشارے بھی موجود ہیں"۔ [۴]

جوگندر پال کا ناول ''پار پرے'' ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا جس میں انہوں نے ہندوستان کی تاریخ وتہذیب کا مکمل منظر پیش کیا ہے یہ ناول ہمارے نام نہاد مہذب معاشرے پر طنز ہے،مصنف نے علامتی انداز تحریر اپنایا ہے اور زبان و بیان عمدہ استعمال کی جو اس ناول کا خاصہ ہے۔

جوگندر پال نے اُردو ناول کے ذریعے ہندوستان کی صدیوں کی مشترکہ تاریخ وتہذیب کی روایت تک قاری کی رسائی کروائی جس کے سبب یہ ناول بھی نئی صدی کے ناولوں میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہوا ہے۔

اکیسویں صدی کے نمایاں ناول نگاروں میں ایک نام عبدالصمد کا بھی ہے جنہوں نے تسلسل کے ساتھ ناول لکھے۔ ۲۰۰۴ء میں انہوں نے ''دھمک'' کے عنوان سے ناول لکھا جس کا موضوع ذات پات کی تقسیم، بدعنوانی، سیاسی پارٹیوں کے مفادات اور ان سب کے نتیجے میں درپیش آنے والی مشکلات کو انہوں نے موضوع بنایا ہے، درحقیقت سیاست ان کا پسندیدہ موضوع ہے جس پر وہ لکھنا پسند کرتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ''بکھرے اوراق'' شائع ہوا جو گزشتہ ناول کی طرز پر لکھا گیا ہے اس ناول پر رحمٰن عباس اپنے خیالات مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"''بکھرے اوراق'' ایسے بکھرے اوراق ہیں جن میں ہندوستانی سماج کی سیاسی اور معاشی تصویر کے پس پردہ مسلمان خود احتسابی کر رہا ہے۔ "[۵]

یہ ناول موضوعاتی طور پر سیاسی و معاشرتی کشمکش پیش کرتا ہے ۲۰۱۳ء میں ان کا ایک اور ناول ''شکست کی آواز'' سامنے آیا جس میں مصنف پہلی بار سیاست سے ہٹ کر ایک نیا موضوع اپناتے ہیں اس میں عبدالصمد نے نفسیاتی اور جنسی مطالعے کی طرف توجہ دی ہے۔

شموئل احمد کا شمار بھی ان ہندوستانی ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نئی صدی میں تسلسل کے ساتھ ناول کی صنف میں طبع آزمائی کی ۲۰۰۳ء میں ان کا ناول ''مہاماری'' شائع ہوا جس میں وہ سیاسی و اخلاقی بدکرداریوں کو عیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر کچھ خامیوں کی وجہ سے یہ ناول دیرپا تاثر نہیں دے پایا، اس حوالے سے انور پاشا کی رائے ملاحظ کریں۔

"یہ موضوعات جس سنجیدہ ٹرٹمنٹ کا تقاضا کرتے ہیں، اس کا اس ناول میں فقدان

> پایا جاتا ہے۔صاف اور سپاٹ بیانیہ وقتی طور پر قاری کو اپنے گرد و پیش سے آگہی کا موقع تو ضرور فراہم کرتا ہے،لیکن اس کی فکر میں دیرپا تحرک پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ "[۶]

زیرِ بحث ناول کے بعد ۲۰۱۵ء میں ''اے دل آوارہ'' کے نام سے ان کا ایک ناول شائع ہوا اور ۲۰۱۶ء میں ''گرداب'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

۲۰۰۳ء میں صلاح الدین پرویز کی کتاب ''دی وار جرنلس'' منظرِ عام پر آئی جسے انہوں نے ''مشرق کے نام'' سے منسوب کیا ہے۔اس کتاب میں انہوں نے امنِ عالم کو درپیش خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے۔اس ناول کی کہانی اعراق،افغانستان، پاکستان اور ہندوستان کے مختلف حادثات کے گرد گھومتی ہے اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر کئے جانے والے حملے کا ذکر بھی ملتا ہے یہ ناول مختلف موضوعات کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ ۲۰۰۶ء میں ان کا ایک اور ناول ''ایک ہزار وارداتیں'' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

۲۰۰۵ء میں ''اہنکار'' کے عنوان سے نور الحسنین نے ناول لکھا جو زیادہ دلچسپی پیدا نہ کر پایا تو ۲۰۱۳ء میں انہوں نے ایک اور ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کے نام سے لکھا جیسے ان کی دلکش تحریر کے طور پر یاد کیا جاتا ہے اس ناول میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا نقشہ کھینچا ہے یہ ناول صرف تاریخی اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ زندگی کے پیچ وخم کو بھی عیاں کرتا ہے، ۲۰۱۵ء میں ان کا ایک اور ناول ''چاند ہم سے باتیں کرتا ہے'' بھی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

۲۰۱۱ء میں پیغام آفاقی کا ناول ''پلیتہ'' منظرِ عام پر آیا جس میں انہوں نے کالا پانی کو محور بنا کر قدیم دور سے عصرِ حاضر تک کے تمام انسانی مسائل کا محاسبہ کیا ہے اسے طنزیہ ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔
حقانی القاسمی اس ناول سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں۔

> "پلیتہ اسی EXISTENCE کے ثبوت کی تلاش سے عبارت ہے۔آج کا ہر آدمی اپنے وجود کے ثبوت کی تلاش میں ہے جب تک وہ محکوم ہے وہ آج اسی طرح اپنے وجود سے محروم ہوتا رہے گا۔۔۔خاص طور پر محکومیت کی اس کائنات سے جس کا نام عوام ہے۔جبکہ حقیقت میں عوام ہی حاکم ہے یہ ناول اس قلبی ماہیت کی تبلیغ بھی ہے۔ "[۷]

نئی صدی کے ناول نگاروں میں ایک نام رحمان عباس کا بھی آتا ہے جن کے تین ناول منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ناول ''نخلستان کی تلاش'' ۲۰۰۴ء میں، دوسرا ناول ''ایک ممنوعہ محبت کی تلاش'' ۲۰۰۹ء میں جبکہ ''خدا کے سایۓ میں آنکھ مچولی'' ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔

''نخلستان کی تلاش'' کشمیر کے حالات اور ہندوستانی سیاست میں بڑھتی ہوئی فسطائیت پر لکھا گیا ہے جبکہ ''ایک ممنوعہ کی تلاش'' رومانی قصے پر محیط ہے اور تیسرا ناول ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' انسانی نفسیات کے مطالعے کا خوبصورت اظہار ہے۔

خالد جاوید کا ناول ''موت کی کتاب'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ڈرامائیت، مبالغہ آرائی اور فنتاسی سے بھرپور ہے یہ ناول ایک کردار کے اردگرد گھومتا ہے جو اپنے والدین سے ناخوش ہونے کے سبب بیوی پر بھی غصے کا اظہار کرتا ہے اس کی بچپن کی ذہنی خلیج اسے ذہنی مریض بنا دیتی ہے، خالد جاوید نے ناول شائع کروانے سے پہلے تصحیح کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کو بھیجا اور بعد میں شائع کروایا اس بات پر انہیں تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑا ۲۰۱۴ء میں ان کا ایک اور ناول ''نعمت خانہ'' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔

اردو ناول نگاروں کے فہرست میں ایک نام انیس ناگی کا آتا ہے جن کے متعدد ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس صدی کے ابتدائی سالوں میں ان کے تین ناول شائع ہوئے ۲۰۰۴ء میں ''ناراض عورتیں''، ۲۰۰۷ء میں ''بریگیڈ ۳۱۳'' جبکہ ''پتلیاں'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

اکیسویں صدی کے ناول نگاروں میں ایک نام احمد صغیر کا بھی آتا ہے جن کے تین ناول ''جنگ جاری ہے'' ''دروازہ ابھی بند ہے'' اور ''ایک بوند اُجالا'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ''دروازہ ابھی بند ہے'' ۲۰۰۸ء میں جبکہ ''ایک بُوند اُجالا'' ۲۰۱۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ''ایک بُوند اُجالا'' عورت کی بغاوت کا نفسیاتی تجربہ ہے۔ اس ناول میں انسانی نفسیات کی مختلف پرتیں دیکھنے کو ملتی ہیں، یہ ناول انسانی فطرت میں بغاوت کا المیہ ہے۔ اپنے ابتدائی دونوں ناولوں میں احمد صغیر کو کوئی خاطر خواں کامیابی نہیں ملی مگر زیرِ بحث ناول اکیسویں صدی کے اہم ناولوں میں شامل ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

اُردو ناول نگاروں کی روایت میں خواتین ناول نگاروں کی خدمات ڈھکی چھپی نہیں ہیں، ماضی میں خواتین نے اس صنف پر کم توجہ دی مگر عصرِ حاضر میں خواتین کی بڑی تعداد ناول کی صنف میں طبع آزمائی کر رہی ہے جن میں سے چند خاص کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔

بانو قدسیہ اُردو ادب میں ایک بڑا نام ہیں، ۲۰۰۰ء میں ان کا ناول ''موم کی گلیاں'' جبکہ ۲۰۰۳ء میں ان کا ناول ''حاصل گھاٹ'' شائع ہوا جو نئی نسل کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں مصنفہ مختلف بحثیں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس ناول میں وہ سیاسی واقعات اور سیاسی شعور کو پیش کرتی ہیں اس ناول کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستانی تخلیق کار اب خیالی دنیا چھوڑ کر حقائق کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔

۲۰۰۳ء میں خالدہ حسین کا ناول ''کاغذی گھاٹ'' شائع ہوا جس میں انہوں نے چھوٹے کینوس پر صدیوں کا دل گیر کر دینے والا ماجرا بیان کیا ''کاغذی گھاٹ'' درحقیقت ایک استعارہ ہے سماجی، سیاسی اور اخلاقی تباہی و بربادی کا جو ہندوستانی معاشرے کا مقدر بنتی جا رہی ہے ناول کے آخر میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا منظر سامنے آتا ہے۔

ترنم ریاض کا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا جو اصلاحی ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، مصنفہ نے اس ناول میں ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس کے اسباب کو موضوع بنایا ہے۔ ۲۰۰۹ء میں ان کا ایک اور ناول ''برف آشنا پرندے'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا جو قدرے ضخیم ناولوں میں شمار ہوتا ہے اس ناول میں پہلی بار کسی ناول نگار نے کشمیر کی سیاسی صورتحال سے ہٹ کر کشمیر کی برسوں پُرانی سماجی تاریخ پر نظر ڈالی ہے ناول میں کشمیر کی خوبصورتی کو دیکھا جا سکتا ہے۔

صادقہ نواب سحر نے ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' کے عنوان سے ۲۰۰۸ء میں ناول لکھا جس میں عورت پر ہونے والے صدیوں سے ظلم و ستم کو موضوع بنایا گیا ہے اس ناول کی مرکزی کردار متاشا میں ایک اچھے کردار کی تمام خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں، ۲۰۱۶ء میں صادقہ نواب سحر کا ایک اور ناول ''جس دن سے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں میں ایک نام شائستہ فاخری کا بھی آتا ہے جن کا ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' ۲۰۱۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا، اس سے پہلے یہ رسالہ ''آمد'' میں بھی شائع ہو چکا تھا یہ ناول عورت کی بے بسی اور مظلومیت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مرد کی خود احتسابی کو بھی عیاں کرتا ہے۔

ساجدہ زیدی بنیادی طور پر ایک شاعرہ کے طور پر جانی جاتی ہیں مگر ۲۰۰۰ء میں ان کا ایک ناول ''مٹی کے حرم'' منظرِ عام پر آیا اس سے پہلے بھی وہ ایک ناول ''موج ہوا پیچاں'' کے نام سے لکھ چکی ہیں۔

نجمہ سہیل نے ۲۰۱۰ء میں ''اندھیر ہونے سے کچھ پہلے'' کے عنوان سے ناول لکھا جس میں انہوں نے نکھری ہوئی اُردو زبان کا استعمال کیا۔

۲۰۰۵ء میں ''اندھیرا پگ'' کے عنوان سے ثروت خان کا ناول سامنے آیا جس کا موضوع بیوہ کی زندگی ہے، ثروت خان ہمیشہ ہی قدرے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کے حوالے سے مشہور ہیں۔

عصر حاضر میں پاکستانی ناول نگاروں کی فہرست میں ایک اہم نام طاہرہ اقبال کا ہے جن کا پہلا ناول ۲۰۱۶ء میں ''نیلی بار'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا اس سے پہلے یہ ناول سہ ماہی رسالہ ''اجراء'' میں چار قسطوں میں شائع ہو چکا تھا اس ناول کے ذریعے طاہرہ اقبال نے خود کو عصرِ حاضر کے نمایاں ناول نگاروں کی فہرست میں شامل کرلیا

ہے، جبکہ ان کا دوسرا ناول ''گراں'' بھی ۲۰۱۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔

عصرِ حاضر کی نمایاں ناول نگاروں میں اور ایک نام آمنہ مفتی کا بھی ہے جن کا پہلا ناول ''جرأت رندانہ'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا اور ۲۰۱۹ء میں ان کا ایک اور ناول ''پانی مر رہا ہے'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

صالحہ عابد کے متعدد ناول شائع ہو چکے ہیں، ۲۰۱۳ء میں ان کا ناول ''اپنی اپنی صلیب'' شائع ہوا۔

اکیسوں صدی میں ناول نگاری کے حوالے سے متعدد لوگوں کی خدمات نظر آئیں جن میں سے چند اہم کا ذکر تفصیل سے کرنا محال تھا مندرجہ ذیل ہیں۔

کشمیری لال ذاکر کا ناول ''کرماں والی'' ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔

سرور غزالی کا ناول ''دوسری ہجرت'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔

سلیم شہزاد کا ناول ''سانپ اور سیڑھیاں''بشیر امام کا ناول ''جب گاؤں جاگے'' دونوں ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آئے۔

محمد عاصم بٹ کا ناول ''دائرہ'' ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۸ء میں چھپا۔

محمد خالد اختر کا ''چاکیواڑہ میں وصال'' اور ساجد زیدی کا ''مٹی کے حرم'' دونوں ناول ۲۰۰۰ء میں شائع کیے گئے۔

محمد حمید شاہد کا ناول ''مٹی آدم کھاتی ہے'' محمد الیاس کا ''کہر'' ظفر عدیم کا ''شوفر'' ۲۰۰۷ء میں منظرِ عام پر آئے۔

جیتندر ربلو کا ناول ''وشواس گھاٹ'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا جو کہ موضوعاتی ناول ہے۔

راج بہادر کرشنا کا ناول ''گرداب'' ۲۰۰۶ء میں جبکہ ناصر بیگ چغتائی کا ناول ''سلگتے چنار'' ۲۰۱۹ء منظرِ عام پر آیا۔

۲۰۱۸ء میں نیلم احمد بشیر کا ناول ''طاؤس فقط رنگ'' جبکہ ۲۰۱۷ء میں فہمیدہ ریاض کا ناول ''قلعہ خاموشی'' شائع ہوا۔

اکیسویں صدی کے ان بیس برسوں میں متعدد ناول منظرِ عام پر آئے جن کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُردو ناول اپنے لیے روشن راہیں بنانے کی طرف راغب ہو چکا ہے جو ایک خوش آئندش بات ہے۔

حوالہ جات

۱ ۔ ڈاکٹر محمد بہادر علی، اُردو ناول ایک تکنیکی جائزہ، ص: ۲۰

۲ ۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، اُردو ناول کے ہمہ گیر سرورکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص: ۳۹

۳ ۔ ڈاکٹر منصور خوشتر، اُردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص: ۱۵۴

۴ ۔ قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ہم عصر اُردو ناول ایک مطالعہ، ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۹

۵ ۔ رحمٰن عباس، اکیسویں صدی میں اردو ناول، سہ ماہی سمت، ا جولائی ۲۰۱۶ء

۶ ۔ قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ہم عصر اُردو ناول ایک مطالعہ، ایم۔آر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۴

۷ ۔ ڈاکٹر منصور خوشتر، اُردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص: ۲۰۵

باب سوم :

مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری (۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۰ء تک) فنی وفکری جائزہ

ا ۔ ''پوکے مان کی دنیا''
ب ۔ ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان''
ج ۔ ''لے سانس بھی آہستہ''

پو کے مان کی دنیا

پو کے مان کی دنیا اپنی طرز کا انوکھا ناول ہے جس کے لکھنے پر مشرف عالم ذوقی مبارکباد کے مستحق ہیں، ۱۷۲ صفحات پر مشتمل یہ ناول جنریشن گیپ، بدلتی ہوئی تہذیب کی تصویر کشی کرتا ہے۔

نئی نسل ہمیشہ سے ہی ذوقی کے مشاہدے کا حصہ رہی ہے، ایک جاپانی کمپنی کے بنائے گئے اینیمیشن سیریل پو کے مان کو ذوقی نے کمال مہارت سے ناول کا موضوع بنا کر معاشرے کے ایک بڑے مسئلے پر نظر ثانی کی ہے جوان کے مشاہدے کی گہرائی کا نمونہ ہے۔

ناول کی کہانی دو معصوم بچوں کے گرد گھومتی ہے، جو کھیل کھیل میں جنسی حدیں پار کر جاتے ہیں، مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کے ذریعے اُن تمام حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو نوجوان نسل کی بگاڑ کی وجہ ہیں۔

ذوقی نے یہ ناول ۲۰۰۴ء میں مکمل کیا جب ایشیا میں موبائل فون انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا ہر بچے کی پہنچ میں نہیں تھا مگر ناول کے مطالعے کے بعد اس بات کو ماننے میں کوئی قباحت نہیں کہ ذوقی کی مستقبل بین نگاہ نے مستقبل میں پیش آنے والے حالات کو دیکھ لیا تھا، آج "پو کے مان" عہد حاضر کی تصویر کے روپ میں سامنے آ چکا ہے۔

دورِ جدید میں جنریشن گیپ شاید ہی کسی ناول نگار نے اس عمدگی سے پیش کیا ہو۔

عصر حاضر میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویڈیو گیمز، کارٹون اور جنک فوڈ جیسی مغربی متعلقات نے جن کا ہماری مقامیت سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارے رویوں پر نہ صرف اثر انداز ہوئی ہیں بلکہ اپنے واضح نقوش بھی مرتب کیے ہیں۔

دنیا نے جب ایک گلوبل ویلیج کا روپ لیا تو جہاں اس کے فوائد سامنے آئے وہیں نقصانات بھی عام انسان کے حصے میں آئے۔

سائبر ساختہ جنریشن گیپ، جس طرح سے آج اولاد اور والدین ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ذوقی نے اس ناول کے پسِ نظر میں ایک سادہ اور عام سی بات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ آج کی نوجوان نسل جس گلوبلائزیشن کے پیچھے چل رہا ہے، اس سے ایک ایسی تہذیب سامنے آ رہی ہے جو ہوس پرستی کی ترغیب دیتی ہے۔

ناول اس نقطے کے گرد گھومتا ہے کہ نئی نسل کا ذہنی بگاڑ کس طرح سے جنم لیتا ہے اور یہ کس حد تک نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر مظہر عباس "پو کے مان کی دنیا" کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پو کے مان کی دنیا'' نو استعماریت، صارفیت، میڈیا، گلوبلائزیشن، انٹرنیٹ چیٹنگ، جنک فوڈ کے اثرات کے نتیجے میں تبدیل ہوتی اخلاقیات اور روایتی اقداری سانچوں کے درمیان کشمکش کو سامنے لاتا ہے۔ ناول ہندوستان کے تناظر میں تیسری

دنیا کی تہذیبی اور ثقافتی شکست وریخت اور خاص طور پر جنس کے حوالے سے
بدلتے رویوں کو زیر بحث لاتا ہے۔ "[۱]

ذوقی کے اکثر ناولوں میں بدلتی ہوئی تہذیب کا نوحہ گونجتا ہے "پوکے مان کی دنیا" کا موضوع بھی یہی ہے۔
نئ تہذیب کے اثرات نے سب کو اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے نہ چاہتے ہوئے بھی آج ہم اس کا حصہ بن چکے ہیں، نئ نسل جو اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے اصل ہیروؤں سے دور ہو چکی ہے اس کے لیے نئ تہذیب کو قبول کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔

دنیا جس خطرناک دور سے گزر رہی ہے اس میں والدین نے ایک طریقہ یہ نکال لیا ہے کہ بچوں کے ہاتھ میں، موبائل، کمپیوٹر اور ٹی وی کا ریموٹ دے دیا تا کہ وہ گھر سے باہر کم نکلیں اور گھر میں ہی محفوظ رہیں مگر یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے ذوقی نے اس ناول کے ذریعے اس سوچ کی تردید کی ہے کیونکہ بچوں کو گھر کی چاردیواری میں بند کر دینا اور سوشل میڈیا، الیکٹرونک میڈیا کے دروازے ان کے لئے کھول دینا خود اس معصوم ذہن کے لیے تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

ناول کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کچھ سوالات بھی گردش کرتے ہیں۔ سونالی کس طرح شکار ہوتی ہے؟ کیا اس نے کوئی کھیل کھیلا، یہ موجودہ دور کا سب سے اہم سوال ہے کہ آخر مجرم کس کو ٹھہرایا جائے؟
مغربی تہذیب کو؟ یا والدین کو؟ بچوں کو؟

مغربی تہذیب نے اس سائبر کلچر کے بدلے ہم سے ہماری تہذیب چھین لی، نئ نسل جو دراصل کمپیوٹر، انٹرنیٹ کیفے اور موبائل پر پروان چڑھ رہی ہے جن کی زندگی کا مقصد صرف عیش وعشرت اور جنسی لذت ہے۔

بچے کا ناپختہ ذہن ایک خالی CD کی طرح ہوتا ہے جس میں آپ جو چاہیں Feed کر سکتے ہیں معاشرے کی اس بگاڑ کی ایک وجہ والدین کی لاپروائی بھی ہے والدین اپنی تیز دوڑتی زندگی میں بچوں کی طرف توجہ دینا بھول جاتے ہیں جس کے نتیجے میں نتن، ریا اور روی جیسے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

" کچھ باتیں قانون سے بلند ہوتی ہیں۔ مائی ڈیراڈوانی۔ دراصل مجھے پتا بھی نہیں چلا اور بچے بڑے ہو گئے۔ میں بچوں کی پسند ناپسند اور شوق کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا۔ بچے اُڑتے رہے۔ زمانہ بدلتا رہا۔ پروموشن کی فکر اور قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں الجھا رہا۔ سوچتا ہوں کتنی دیر ہو گئی بچے مجھ سے کتنی دور چلے گئے۔" [۲]

روی اور سونالی کے ذہن میں ایسے خیالات نے کیسے قدم رکھا اس کے لئے دونوں خاندانوں کے گھروں کے ماحول کا بہت عمل دخل ہے اس میں قصوروار وہ بچے نہیں بلکہ غلطی والدین سے سرزد ہوئی ہے جس کی سزا وہ بچے بھگت رہے ہیں۔
روی کے والدین کے حوالے سے ایک اقتباس ناول سے پیش کیا جا رہا ہے جس کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا کہ

کیسے روی اور سونالی کے ذہن میں اس طرح کے خیالات ابھرے اور وہ اس غلطی کی طرف بڑھے جس کی سزا نہ صرف انہیں بلکہ ان کے خاندانوں کو بھی ملی ۔

"شالنی دیورت کی کمزوری تھی ۔شالنی کو بے حد مانتا تھا۔فاؤنڈیشن نئی ساڑیاں ، ماڈرن ڈریسز ، سینما لے جانا۔خود بھی وہ دیکھنے میں ۴۵ سے کم کا لگتا تھا۔رات میں پینے پلانے کے بعد ایسا بھی ہوتا جب دونوں پتی پتنی وی پلیر پر بلو فلم کی سی ڈی چلا کر چھوڑ دیتے ۔بابا کی فکر نہیں تھی بابا کو بائی کے پاس بھیج کر دونوں مطمئن ہو جاتے ۔" [۳]

ایسے ماحول میں رہنے والے بچوں کے ذہن میں جو نئے نئے خیالات وقوع پزیر ہوتے ہیں ان کے لئے نیا سے نیا جاننے کی کشش ان کو اپنی عمر سے آگے کے خیالات کی طرف لے جاتی ہے اور وہ ایسے کام بھی کر جاتے ہیں جن کا انجام بھیانک ہوتا ہے ایسا ہی روی اور سونالی کے ساتھ بھی ہوا۔الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا سے مستفید ہونے والے بچے آج وقت سے پہلے ہی بالغ ہو رہے ہیں کیوں؟ کیونکہ ارادتاً اور غیر ارادی طور پر انہیں انٹرنیٹ پر ایسی ویب سائٹس مل جاتی ہیں جن کو دیکھنے کے بعد وہ اس کا نہ صرف شکار ہو جاتے ہیں بلکہ کم سن اور ناپختہ ذہن ہونے کی بنا پر وہ اپنے نفس پر کنٹرول نہیں کر پاتے اور نتائج وہی ہوتے ہیں جو روی اور سونالی کے کیس میں سامنے آئے ۔

"میڈیکل سائنس نے بھی ایسے بچوں کے لئے اس سچائی کو تسلیم کیا ہے _ کہ ایسے بچوں میں ۱۲ سال کی عمر میں وہائٹ اسپرم پوری طرح بن سکتا ہے _ ایسے بچوں میں غصہ ، جنگلی پن اور سیکس کی سطح پر اتنی زیادہ درندگی ہوتی ہے کہ وہ کچھ بھی کر گزر سکتے ہیں ۔"[۴]

ذوقی نے ناول کے کردار نکھل اڈوانی کی زبانی عدالت میں بحث کے دوران اس بات کی طرف واضح اشارہ کر دیا کہ روی اور سونالی نے جو کچھ بھی کیا اس میں قصور روی پر نہیں ڈالا جا سکتا اور نہ ہی اسے بلاتکار کا نام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ صرف اب بچوں کے ایک نئے کھیل کی شروعات ہے اور اس میں قصور وار وہ نئی تہذیب ہے جو انہیں یہ سب کچھ سکھا رہی ہے ۔

"بلاتکار نہیں ایک کھیل می لارڈ-بچوں کے بہت سارے کھیلوں میں شامل ہوا ایک کھیل ، جس کا تعلق جسم سے ہے اور بچے دوسرے کھیلوں میں اب اس کھیل کو فوقیت دینے لگے ہیں کیونکہ اب یہ کھیل وہ گھر کے کسی بھی گوشے ، کونے میں کھیل سکتے ہیں اور اس کے لئے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے _ وہ کہاں ہیں ! کہاں جا رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں"۔[۵]

ذوقی نے انٹرنیٹ کے غلط استعمال کا بچوں پر جو اثر ہو رہا ہے اس کو بیان کیا ہے کہ یہ انٹرنیٹ اور کمپیوٹر کے دور میں پیدا ہونے والے سائبر بچے ہیں جن کے مسائل بھی مختلف ہیں ۔

بچوں کے ناپختہ ذہن کو جنس تحفے میں دی جا رہی ہے، بچوں کی نفسیات، خواہشات، رہن سہن خاص طور پر جنسی خواہشات سب کو ذوقی نے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ آنے والی نسل اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہی ہے جس میں والدین خاص طور پر ذمہ دار ہیں۔

یہ ناول موجودہ نسل، تہذیب اور معاشرے پر گہرا طنز ہے کہ تہذیبوں کا ملاپ ممکن نہیں۔

انسانی وجود کے جنم لیتے ہی دو جذبے اس کے ساتھ جنم لیتے ہیں ایک بھوک دوسرا تجسس۔

ایک دوسرے کو جاننے، مزید جاننے اور اپنے جذبات کی ترسیل کی خواہش اس تجسس کو مزید آگے بڑھاتی ہے آج کی مادی دنیا میں مادی ترقی کے باوجود ابھی بھی انسان کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا جس کی مثال ناول میں "ویلسی" کی ہے جس کی باتوں میں اس کی تنہائی کا درد بولتا ہے۔

نوجوان نسل جتنی تیزی سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے اتنی ہی جلدی تھکن کا شکار بھی ہو جاتی ہے، وہ لذت اور عیش وعشرت کی رنگا رنگی میں کھو کر دراصل اپنی ذات سے بھی دور ہو جاتی ہے، وہ اندر سے کھوکھلی اور خوفزدہ ہے۔

Blue print, Internet cafe اور On Line pornography کا جنسی طوفان نوجوان نسل کی تباہی کے لئے ہر ممکن ذریعہ ہے۔

والدین بچوں کی محبت میں انہیں ان سہولیات سے آراستہ تو کر دیتے ہیں مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ اس کی وجہ سے وہ بچے ذہنی اور جسمانی طور پر تباہ ہو سکتے ہیں، یہ عیش وعشرت انسانی نسل کے لئے تباہی کا سبب بن رہی ہے جس کی بدولت ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔

فینٹسی اور رئیلٹی کے بیچ میں ڈولتی نوجوان نسل ایک بڑی جنگ کے دہانے پر کھڑی ہے ان کے نزدیک رئیلٹی ہی فینٹسی ہے وہ خود کو طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک آغاز یا انجام کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کی بنا پر آج وہ خود اپنی تہذیب کو ختم کر رہی ہے۔

اس حوالے سے محمد حامد سراج اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ

> " کیا بچے کو مجرم ٹھہرایا جائے گا۔۔۔یا معاشرے کو؟ معاشرہ جس نے ایک معصوم ذہن کو کچی عمر میں ایک پختہ مرد کی جنسی سوچ Inject کی۔ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے کرہ ارض کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ شرم وحیا مشرقی زیور تھا۔ قصہ پارینہ ہوا۔ یہ گلیمر کی دنیا ہے چند روز زندگی کی لذت کشید کرو۔۔۔عیش کرو۔۔۔کیا اس کا نام زندگی ہے؟ کیا واقعی معاشرہ مجرم ہے؟" [٦]

مشرف عالم نے اس ناول کے ذریعے موبائل اور انٹرنیٹ کے غلط استعمال کی طرف توجہ دلائی اس اقتباس کے مطالعے سے

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "پوکے مان" کے پسِ پشت ذوقی نے کس تلخ حقیقت کو بیان کیا ہے۔

"سائبر کرائم کی ہی ایک کڑی ہے۔ آن لائن پورنوگرافی۔ دنیا بھر میں ۶۰ ہزار سے بھی زائد ایسے سائٹس ہیں جو بچوں تک کو آن لائن پورنوگرافی سے تباہ کر رہے ہیں ان کا سب سے برا اثر معصوم بچوں پر پڑتا ہے جو جانے انجانے ایسے سائٹس کو کلک کر دیتے ہیں۔ پھر ان کا تجسس ایسے سائٹس کے لیے بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے سائٹس بچوں کو Sexual کرائم کی طرف اکساتے ہیں۔" [۷]

مصنف نے حقیقت کو بیان کرنا چاہا ہے، انہوں نے ایک نیا موضوع دریافت کیا ہے اردو کے بیشتر ناولوں میں غلامی، تقسیم، ناسٹیلجیا کے موضوعات پر لکھا جاتا رہا ہے، ذوقی نے اس نئے موضوع کا انتخاب کر کے قاری کو نہ صرف حقائق سے آگاہ کرنا چاہا ہے بلکہ قاری کا مزاج بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیرِ بحث ناول سے پہلے اس موضوع پر اردو ادب میں کوئی تخلیق نظر نہیں آتی، ذوقی نے ایک نئی فکر کو جنم دیا ہے اسی وجہ سے ان کے اس ناول کو خاص طور پر ایک نئی تبدیلی کا آغاز کہا جاسکتا ہے۔

ذوقی نے سائبر جرائم پر تفصیل طلب بحث کی ہے وہ چاہے پائریسی_ ہیکنگ_ پورنوگرافی ہو یا سائبر اسٹاکنگ، یہ سب سائبر جرائم کی ہی مختلف شکلیں ہیں، کسی انسان کو خوفزدہ یا ہراساں کر کے انٹرنیٹ کا سہارا لے کر بلا اجازت تصویر کشی کی نمائش جیسے جرائم سائبر کرائم کہلاتے ہیں۔

ناول کے کئی ابواب ہیں۔

ایک سوا کیانویں پوکے مان، پوکے مان لٹریز، کھوگیا ایشن (پوکے مان لٹریز جو ایک اچھا انسان ہے)، جنگلی پف (Meowth) (راکٹ ٹیم کا پوکے مان) اور استعفٰی نامہ۔

ناول کے پس منظر میں دو باتیں گردش کرتی ہیں ایک تو جنریشن گیپ، گلوبلائزیشن اور مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ بیان کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ایک تلخ حقیقت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ سیاسی جماعتیں کیسے اپنے مفاد کے لیے لوگوں کی زندگیوں سے کھیل جاتی ہیں اپنے مطلب کے لئے وہ عام لوگوں کا استعمال کرتی ہیں۔

ذوقی نے بھارت کی سیاست کا وہ گھناؤنا چہرہ دیکھایا ہے جو عورتوں کی عزت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اسی عورت کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے وقت ان کے عزت اور توقیر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"منتری جی کی آنکھیں ایک بار پھر آنکھوں میں گھس رہی تھی_ میڈیا میں آنے دیجئے

خبر کومت روکیے_ پھیلنے دیجئے_ ارے دس پریس والے کو ہم بھی بول دیں گے، جئے
چنگی ہمارا آدمی ہے_ دلت ہے_ اب ریپ کرنے والا کوئی بھی ہو_ ہم دلت کی
sympathy بٹوریں گے_ وہ کیا ہے کہ الیکشن نزدیک ہے_ آپ سمجھتے کیوں
نہیں ہیں۔" [۸]

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی بات پوشیدہ نہیں رہ جاتی جئے چنگی رام کا استعمال کیا جا رہا تھا، سونالی کو کٹہرے میں کھڑا کر کے تکلیف دہ سوالات کا سامنا کروایا جا رہا تھا، اس حادثے میں قصور سونالی یا روی کا نہیں تھا قصور ان کے والدین کا تھا اور اس حادثے کو کیش کیا جا رہا تھا سب سے زیادہ خوش وہ لوگ ہی تھے جن کا براہِ راست اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں تھا نہ وہ سونالی کے خیر خواہ ہوتے ہیں نہ ہی روی کے بلکہ وہ ان دونوں کی زندگیاں برباد کر کے اپنا فائدہ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ تھی کہ باہمی افہام وتفہیم کے معاملے کو زنا بالجبر کا نام دیا گیا تھا جس کے پیچھے ایک ہی مقصد تھا کہ سونالی کے سہارے سیاسی پارٹی دلت ووٹ حاصل کرنا چاہتی تھی براہِ راست ان کی روی سے کوئی دشمنی نہیں تھی مگر سونالی کو مہرا بنا کر وہ الیکشن میں کامیابی چاہتے تھے جس کے لیے روی کو سزا دلوانا لازمی تھا اور نہ وہ دلت قوم کے لئے اپنی ہمدردی کیسے ظاہر کرتے۔

ناول کے مرکزی کردار اسنیل کمار رائے کے ہم خیال اور لوگ جن میں نکھل اڈوانی جو کہ روی کا ڈیفنس لائر اور اس کے لئے ہمدردی کی بنا پر محنت کرنے والا تھا ایک مکالمے میں وہ اس ساری حقیقت پر بحث کرتا ہے تو اسنیل کمار اس تلخ حقیقت سے پردہ ان الفاظ کا سہارا لے کر اتارتے ہیں۔

"تم یہ ساری دلیلیں دے چکے ہو نکھل کیا ملا_؟ یہ معاملہ ہمارا تمہارا کورٹ کا نہیں_ الیکشن
اور پارٹی کا ہے پارٹی کے پاس دلت بینک نہیں ہے_ پارٹی اس ایشو کو دلت بینک بنانا
چاہتی ہے۔" [۹]

شفیع جاوید اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"پو کے مان کی دنیا ایک وسیع استعارہ ہے جس کو تم نے Age Plastic کی بے راہ رویوں
پر انگلی رکھنے کے واسطہ بنایا ہے۔ اس میں پورے معاشرے کا محاسبہ ہے اور رونگٹے کھڑے کر
دینے والی حقیقتوں کا مرقع ہے۔۔۔۔۔ شاید ایسی ہی تحریر سے ہیرے کا جگر کٹتا ہوگا۔" [۱۰]

ذوقی نے ناول کی وحدت تاثر، آفاقیت اور جمالیات کو ایک طرف رکھ کر زمانے کی قریب ترین سچائیوں سے ہمارا سامنا کروایا ہے اس ناول کے بارے میں وہ خود اکثر جگہوں پر لکھ چکے ہیں کہ اس ناول کو لکھنے کے لیے

انھیں کیا کچھ مدنظر رکھنا پڑاانہوں نے پو کے مان پر تحقیق کی اس بارے میں وہ اپنے بیٹے کا بھی ذکر کرتے ہیں جس سے انہیں کافی جانکاری ملی۔

ذوقی نے پو کے مان کے بارے میں جو معلومات اکٹھی کیں ان سب کو انہوں نے ناول میں بھی بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"صرف میٹرو پولیٹن شہروں میں نہیں، بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں قصبوں میں بھی پو کے مان کا جادو چل چکا ہے۔شہری بچوں سے گاؤں کے بچوں تک۔ جاپان کے اس فرضی کارٹون چہروں نے اگر بچوں کے دلوں پر حکومت کی ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔" [۱۱]

ذوقی نے ایک کردار اسنیل کمال رائے کی زبانی بچوں کی نفسیات کی ترجمانی کی ہے کہ بچے آخر کیوں ان کے دیوانے ہیں۔ کیوں انہوں نے رئیلٹی کو پس پشت ڈال کر اس فنتاسی میں جینا پسند کیا، ذوقی نے مکمل تفصیل کو ناول کا حصہ بنایا ہے اور آخر میں اس بات کا جواب بھی دیتے جاتے ہیں کہ آخر کیوں دو بارہ سال کے بچوں نے اپنی کم عمری میں ہی جنسی دنیا میں قدم رکھ لیا۔

"پو کے مان نے بچوں کو فنتسی کے وہ کھیل دیے ہیں کہ بچے انہیں حقیقت میں دہرانا چاہتے ہیں۔اور اسی درمیان تھوڑی سی بڑھتی عمر میں تیزی سے ایک چیز بچوں میں داخل ہو چکی ہوتی ہے۔sex۔ بچے بس اس آخری فنتاسی کو کر گزرنا چاہتے ہیں۔۔۔ اور وہ گلہری پو کے مان، خرگوش پو کے مان سے اچانک سانپ پو کے مان بن جاتے ہیں۔ایک لہر آتی ہے۔گزر جاتی ہے۔" [۱۲]

ذوقی نے طویل اقتباس سے یہ بات باور کروانی چاہی کہ وقت کیسے بدل رہا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ تہذیب کا نوحہ بھی ان کی تحریروں میں شامل تھا، ذوقی نے ان تمام حقائق کو بیان کیا جس کی وجہ سے ایک بارہ سال کا معصوم بچہ ایک ملزم کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

"داڑھی لگائے اسامہ پر امریکی گولہ باری ہو رہی ہے۔ بچے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہیرو ولن اور ولن کو ہیرو بنایا جا رہا ہے۔نئی سنسکرتی کچھ بھی کر سکتی ہے۔نئی سنسکرتی نے بچوں کی آنکھوں سے میراکل، چمتکار اور حیرت کی چمک چھین لی۔ہتھیار دے دیئے اور ایک نیا کھلونا۔" [۱۳]

ذوقی کے ناولوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی پائی جاتی ہے کہ ہر ناول میں اولاد اپنے والدین سے خاص طور پر باپ سے ناخوشی کا اظہار کرتی ہیں اس کا سبب ان کا معاشرے کا وسیع مطالعہ ہے جس میں وہ سب سے بڑی

وجہ جنریشن گیپ کوقرار دیتے ہیں ، زیرِ بحث ناول میں بھی اسنیل کمار رائے کے سامنے ان کے بچے نتن اور ریا ایسے مکالمے ادا کرتے ہیں جسے کسی باپ کے لیے سننا ہمت کا کام ہے بچے ماں باپ سے اس قدر خائف ہو سکتے ہیں اس کا اندازہ ناول کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے جہاں باپ کے کمرے کو لاک اپ بولا جاتا ہے اور اُس کے نظریات کو جھٹلایا جاتا ہے۔

"ریا زور سے چیختی ہے_ یہ ہے جنریشن گیپ_ آپ کے اور ہمارے بیچ کا ڈیڈ_ اونلی جنریشن گیپ_ آپ صرف ہماری جنریشن میں بیکٹر یا ڈھونڈو گے_ غلط باتوں کا بیکٹیریا یو آر سو کنزرویٹو اینڈ اولڈ فیشنڈ بدلے ہوئے زمانے میں آپ ہمیں Accept کرو گے ہی نہیں۔" [۱۴]

ایک طرف ریا اور نتن ہیں تو دوسری طرف سونالی اور روی , ریا اور نتن کی طرح سونالی اور روی بھی اپنے والدین سے خائف نظر آتے ہیں ناول میں ایسے مکالمے دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں سونالی اپنے باپ جئے چنگی رام کے لئے زہر اگل رہی ہوتی ہے تو دوسری طرف کچھ ایسا ہی منظر روی کنچن کے گھر میں بھی نظر آتا ہے وہ بچہ بھی والدین کیلئے خاص جذبات نہیں رکھتا۔

روی سے مکالمے کے دوران سنیل کمار اس نئی نوجوان نسل کے خیالات کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ نسل ایک جیسا سوچتی ہے، صرف کامیاب ہونا چاہتی ہے اپنے حریف کو زیر کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے۔

" کیوں نہیں سامنے والا اگر آپ کو مار رہا ہے تو آپ دیکھتے رہو گے؟ ایک لمحے کو میری آنکھوں میں نتن کا چہرہ ابھرا۔۔۔ گودھرا ہو گا تو گجرات بھی ہو گا نتن نے روی کا چہرہ پہن لیا تھا یا روی، اچانک نتن بن گیا تھا۔" [۱۵]

اس اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ نئی نسل کے خیالات کس خوفناک حد تک جا رہے ہیں۔

ریفام ہاؤسز جہاں ملزم بچوں کو رکھا جاتا ہے یہ جیل کے مترادف کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیل میں بچوں کو اس لیے نہیں بھیجا جاتا کیونکہ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک مجرم ہوتا ہے اور ان کے ساتھ رہ کر بچوں میں بڑا مجرم پل سکتا ہے۔

مگر یہاں قابل افسوس بات یہ ہے کہ ریفام ہاؤسز میں بھی بچے محفوظ نہیں ہوتے وہاں بھی انہیں ذہنی اور جسمانی اذیت دی جاتی ہیں جس میں وہاں کا عملہ ہی سب کارگزاری کا سبب ہوتا ہے۔ ذوقی نے اس پر سے بھی پردہ

اٹھایا ہے، روی کے کیس پر تعینات ، بورڈ کے ہی ایک ممبر پر ما کر بندھو اس پر تحقیق کرتا ہے وہ روی سے ملتا ہے جہاں اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ روی کو وہاں بھی عملہ کی طرف سے ہوس کا نشانہ بنایا جا رہا ہوتا ہے جس کا روی پر بہت برا اثر پڑ سکتا ہے اس لیے روی کو وہاں سے نکالنا بہت ضروری تھا۔

"پر ما کر بندھو بتا رہا ہے ایسا ہوتا ہے ریفارم ہاؤس میں اس لیے چھوٹے
بچوں کو وہاں ڈالنے کے میں خلاف ہوں یہاں یہ اچھے نہیں ہو سکتے ـ
وارڈن، سپرنٹنڈنٹ، سب کے سب ملے ہوتے ہیں۔" [۱۶]

اسنیل کمار کی ڈائری میں ۱۸۔۳۔۲۰۰۴ء کا دن ایک واقعہ کا گواہ ہے جب پر ما کر بندھو نے ریفارم ہاؤسز کے حوالے سے ایک رپورٹ بنائی اور روی کے معاملے کے سلجھتے ہی وہ اس پہلو کو اجاگر کرنے والا تھا۔

"سونی پت ریفارم ہاؤس کے چیتھڑے بکھیر کر رکھ دیے تھے۔کوئی بھی ایک لفظ نہ کم نہ
زیادہ تھا۔کہیں بھی جذباتیت کا غیر ضروری مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اپنے پرانے
تجربوں کی روشنی میں یہ رپورٹ ایسے بچوں کے لیے نئے راستے کھول سکتی تھی، جہاں
جیونائل کورٹ میں ان پر مقدمہ درج ہوتے ہی انہیں سدھار گھروں میں بھیج دیا
جاتا ہے۔" [۱۷]

ذوقی نے اس تلخ حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے جو مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ذوقی نے ہمارے معاشرے کی گھناونی سیاست کا پردہ فاش کیا ہے، ہمارے ہاں انصاف کے ترسیل میں سب سے بڑی رکاوٹ سیاسی نظام ہے جس کو ذوقی نے اس ناول میں بے نقاب کیا ہے۔

"منتری جی غصے میں تھے۔جائیے۔کیس کا تیا پانچا کر دیجئے۔بچہ ہے تو کیا۔ہمارے
ڈیپارٹمنٹ کو ہم بول دیں گے۔۔۔آپ اپنا ادھیکار سنائیے۔فیصلہ۔تاریخ مت
بڑھائیے۔ابھی ایک دلت لہر ہمارے فیور میں بھی ہے۔آپ اپنا دھیکار سنائیے۔
فیصلہ۔تاریخ مت بڑھائے۔اس لئے اس مدعے کو ابھیان بنانا ہے سمجھ رہے
ہیں نا؟" [۱۸]

ناول میں ایسے تلخ جملوں کی بھرمار نظر آتی ہے جس میں ذوقی نے کرداروں کے ذریعہ سے معاشرے میں پائی جانے والی بگاڑ پر غصے کا اظہار کیا ہے۔

ذوقی نے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو ہر ناول میں جگہ دی ہے، بے شک براہ راست اس ناول

میں ایسے تذکرہ نہیں ملتے مگر ۲۰۰۲ء میں ہونے والے گجرات حادثے کو ذوقی نے ضمنی طور پر ناول میں شامل کیا ہے وہ چونکہ صحافت سے گہرا ربط رکھتے ہیں اس لئے ان کے ناولوں میں بھی صحافتی رنگ نظر آتا ہے، زیرِ نظر ناول میں انہوں نے اخبارات کے اقتباسات کو ناول میں جگہ دے کر گجرات واقعہ پر سیاسی صورتحال کی بھی عکاسی کی ہے۔

" گجرات میں مودی سرکار جیل میں بند مسلم قیدیوں پر کہر ڈھا رہی ہے۔ حال ہی میں ایک واقعہ سے اس بات کا انکشاف ہوا ہے۔ الزام ہے کہ آٹھ جنوری کو سابرمتی جیل میں نماز عصر میں مصروف قیدیوں پر پولیس نے وحشیانہ لاٹھی چارج کیا۔ جس میں چھ قیدیوں کو چوٹیں آ گیں۔۔۔" [۱۹]

ذوقی کے دل پر ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کا اثر ہوتا ہے جس کا اظہار وہ اپنی کہانیوں اور ناولوں میں کرتے رہتے ہیں جن دنوں ذوقی یہ ناول لکھ رہے تھے تب ہندوستان میں گجرات کے مسلمانوں کو مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا براہِ راست نہ سہی پر انہوں نے ان حادثات کو موضوع بحث ضرور بنایا ہے۔
ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے مظالم پر ناول کے مرکزی کردار سنیل کمار رائے اور ان کے بیٹے نتن کے مکالمات جاذبِ نظر ہیں جس کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک ہندو اپنے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کیسے جذبات رکھتا ہے۔

"بی پریکٹیکل پاپا۔ وہ ری ایکشن تھا۔ ری ایکشن میں دو چار گھر جلتے ہیں۔ آپ کے Freedom movement پر ایسے خون خرابے نہیں ہوئے تھے_؟۔۔۔ وہ گودھرا کریں گے تو گجرات ہوگا۔ بار بار ہوگا۔ یہی نیوٹنس لاء بھی ہے۔" [۲۰]

اس اقتباس کے مطالعے سے جہاں ذوقی کے خیالات کی وضاحت ہوتی ہے وہیں ہندوستان کے حالات کی پیچیدگی کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

ذوقی نے مختصراً ان رپورٹس کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جو مرکزی کردار کی نظر سے گزرتی ہیں۔

"میں رپورٹ پڑھ رہا ہوں ہو۔ ایشوریا رائے، و پاشا بسو، سہیل سیٹھ۔۔۔ عورت اور مرد کا رشتہ کیسا ہے؟ کیا ایک ۱۲ سال کا لڑکا اپنی ہم عمر کسی لڑکی کے ساتھ Sexual relation بنا سکتا ہے؟ کیا اس عمر میں بچے کے اندر وہ Sensation جمع ہو سکتی ہیں کہ وہ ایک مکمل مرد کی طرح اپنی ہم عمر لڑکی سے پیش آئے۔" [۲۱]

بچوں کے ساتھ عہد حاضر میں زیادتی ہونے کے وقعات روز بروز بڑھ رہے ہیں ذوقی نے ایک رپورٹ ان

کیسز کے اعداد وشمار کے حوالے سے بھی پیش کی ہے۔

"سال ۱۹۹۰ء میں ۱۰۰۶۸ معاملوں میں ۲۰۱۵ دس سے سولہ سال کے بچے تھے اور ۳۹۴
لڑکیاں، جن کی عمر دس سال سے کم تھی ملک کی راجدھانی میں بلاتکار کے واقعات میں
بچوں کا پرسنٹیج بڑھتا ہی جارہا ہے۔ اب ایسے جرائم میں دوتہائی نابالغ بچے ہوتے ہیں۔
ابھی حال ہی میں ریپ کے ۱۶۲ معاملوں میں ۹۸ نابالغوں کے خلاف تھے۔" [۲۲]

یہ رپورٹس مشرف عالم ذوقی کے وسیع مطالعے کا ثبوت دیتی ہیں۔

ناول کے تحقیقی اور تنقیدی جائزے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ "پوکے مان" کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں

"پوکے مان کردار کا اختراع جاپان کی ایک کمپنی نے ۱۹۹۶ء میں کیا جو انگریزی کے دو الفاظ
"پاکٹ مانسٹر" کا مخفف ہے، جس کا مطلب "جیب میں رہنے والا دیو" ہے۔" [۲۳]

پوکے مان دراصل بچوں کے کارناموں پر مشتمل جاپانی لوک کتھاؤں سے لیے گئے کردار ہیں، بچے خاص طور پر ان کے ناموں اور کارناموں سے واقفیت رکھتے ہیں۔

ٹیلی ویژن پر کم وپیش ایک سو پچاس پوکے مان کردار دکھائے جاتے ہیں جبکہ ایک سو اکیاون واں "پوکے مان" ذوقی نے پیش کیا ہے جو ناول کے مطالعے کے بعد ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

زیرِ بحث ناول کا پلاٹ سادہ ہے مگر زندگی کے وسیع تجربات کا احاطہ کرتا ہے ذوقی نے اسلوب میں جرات اور بے باکی کا استعمال واضح طور پر کیا ہے مگر اس کے باوجود بھی کہیں ناہمواری کا احساس نہیں ہوتا۔

مجموعی طور پر "پوکے مان کی دنیا" کے پلاٹ میں کوئی خامی نہیں نظر آتی جس سے کہانی کا ربط متاثر ہو یا واقعات میں غیر ہمواری نظر آئے۔ چونکہ پلاٹ کو عمارت کے ڈھانچے کی حیثیت حاصل ہوتی ہے جس کے بغیر ایک اچھے ناول کی تعمیر ناممکن ہوتی ہے ذوقی نے پلاٹ کو اتنی خوش اسلوبی اور سلیقہ بندی سے ڈھالا ہے کہ کہیں بھی واقعات کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا اور قاری کہانی کے مرکز سے جڑا رہتا ہے۔ ناول میں خود کلامی بھی نظر آتی ہے، طویل مکالمات کو بھی انھوں نے اسلوب کا حصہ بنایا ہے ساتھ میں ڈائری کی تکنیک بھی آخر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

ناول کا مرکزی کردار "سنیل کمار رائے" ہی ناول کا راوی ہے اسی کی زبانی ایک معصوم بچے کی کہانی قاری تک پہنچتی ہے جو پوکے مان کا دیوانہ ہوتا ہے اور کھیل کھیل کے اندر ہی اس سے غلطی ہوتی ہے جسے بلاتکار کا نام دے کر اس کی زندگی سے کھیلا جارہا ہوتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار اسنیل کمار رائے جو کہ روی کنچن کا جج ہوتا ہے وہ

اس کیس کے لیے بہت تگ ودو کرتا ہے اور سوچ وبچار کے بعد وہ ایک تاریخی فیصلہ کرتا ہے جو ناول کی اہمیت مزید بڑھا دیتا ہے۔

"میں شاید یہ سب تھوڑا تھوڑا اس لئے بتانا چاہتا ہوں کے آج صبح میرے سامنے ایک کیس آیا ہے_ ابھی میرے ریٹائر ہونے میں کئی برس باقی ہیں مگر_ میں جانتا ہوں، کہ دوسرے ججوں کی طرح میرے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا_ سوائے ایک ایسی زندگی کے جو میں جینا بھی نہیں چاہتا_ یعنی ایک ایسی زندگی کے آپ کے پیشے سے لوگ آپ کے صوفی، سنت ہونے کا بھرم پال لیتے ہیں_ جج_ انصاف کا مندر_ انصاف پسند۔" [۲۴]

سنیل کمار رائے اس فیصلے کے لیے پہلے بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے کیونکہ جب تک وہ اس بات کی تہہ تک نہیں جائے گا کہ آخر کون سے عوامل تھے جس نے ایک بارہ سال کے بچے کے اندر اس کی ہم عمر دوست کے لئے جنسی احساس جگایا وہ اس کے پسِ پردہ گہرائی تک جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ حالات کی سنگینی سے واقف تھا، یہ کیس صرف روی کچن کا نہیں تھا بلکہ اس کے پسِ پردہ وہ اپنے بچوں ریا اور تنن کو بھی دیکھ رہا تھا، ہندوستان کے ہر بچے کے لیے وہ پریشانی محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ ایک جج ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باپ بھی تھا ایک ایسا باپ جس کی اولاد اپنے پر نکلنے کے بعد گھونسلہ چھوڑنے کا سوچ رہی تھی اور یہ غم ان دنوں میاں بیوی کو اندر سے کھائے جا رہا تھا۔

" سوچتا ہوں۔ وہ کیا چیز ہے۔ جو بچوں کو تباہ کر رہی ہے۔ ٹی۔ وی۔ سوپر کمپیوٹر۔ یا گلوبلائزیشن۔ ترقی ہوتی ہے اور ترقی اچھی چیز ہے۔ مگر کیا ہوتا ہے۔ دھاکہ کے ساتھ ایک نئی چیز ہمارے بیچ آ جاتی ہے۔۔۔ اور وہ تنن بھی ہے_ ریا بھی اور وہ بارہ سال کا بچہ بھی۔" [۲۵]

سنیل کمار رائے نے زیادہ تر مکالمے خود سے کیئے ہوئے ہیں خود کلامی کو ذوقی نے اسلوب کا حصہ بنایا ہے مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کریں کہ ذوقی نے کس کمال ہنر مندی سے مرکزی کردار کی زبان سے نئی ٹیکنالوجی کی آنے والے عرصے میں تباہ کاریوں کو بیان کیا ہے۔

"میں نے دھیمے سُر میں اپنے آپ کو آواز دی۔ جو وقت بدل رہا ہے۔ اس کی آواز بیان بھیانک ہے۔ ایک بھیانک طوفان ہے۔ جس کی صدا کم لوگ سن رہے ہیں۔ لیکن یہ طوفان آ چکا ہے۔ مختلف شکلوں میں نئی ٹیکنالوجی اور نئے "سیموگراف" کے طور پر___ طوفان آ چکا ہے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ طوفان سب کچھ بہا کر لے

جائے گا۔" [۲٦]

سنیل کمار رائے کی زندگی میں آنے والے کیسز میں یہ کیس سب سے مختلف تھا جس کے لیے اسے طویل مشاہدے اور مطالعے کی ضرورت پڑی، حقائق تک پہنچتے پہنچتے اس کی فکر کے تمام دھارے بدل چکے ہوتے ہیں وہ انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف رپورٹس کا مطالعہ کرتا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اصل قصوروار کون ہے اور سزا کا مستحق روی کنچن ہے بھی کہ نہیں؟

یہ اور اس طرح کے اور کتنے ہی سوالات تھے جو سنیل کمار رائے کے دماغ میں گونج رہے ہوتے ہیں۔

سنیل کمار رائے کو اس کیس کے لیے نامزد تو کر دیا گیا مگر اس کے لیے انہیں اختیارات کا وہ استعمال نہ کرنے دیا جا رہا تھا جو ایک جج کا حق ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک انصاف پسند جج کی زبان سے ذوقی نے جس حقیقت کی کڑواہٹ کو بیان کروایا ہے وہ قابل تحسین ہے، ملاحظہ کیجئے اس حوالے سے سنیل کمار کے خیالات پر مشتمل ناول کا ایک اقتباس۔

" گڈ فیل فیکٹر۔ یس سر، میری انترآتما خوش ہے۔ اس سیکولر کنٹری میں آپ جیسے
منتری سے مل کر۔ ہم خوش ہیں۔ ایک چھوٹے سے بچے کی بلی دینے کے لیے۔
آئی ایم ویری ویری ہیپی سر۔ مجھے کچھ نہیں سوچنا سر۔ بس ایک فیصلہ سنا دینا ہے۔
گڈ فیل فیکٹر کے حق میں۔" [۲۷]

ذوقی نے مرکزی کردار سنیل کمار کی اس کیس کے حوالے سے درپیش مشکل کو اس کے مکالموں کے ذریعے سے بیان کر دیا ہے وہ جس ذہنی کشمکش سے گزر رہا تھا اس کا اندازہ اس کے دوست وکیل کے ساتھ کئے جانے والے مکالموں کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

" مجھے ایک ایسے معاملے کا فیصلہ سنانا ہے۔ جس نے آزادی کے بعد ہندوستان کی
ایک نئی شکل میرے سامنے رکھ دی تھی۔ جس نے برٹش راج کے قاعدے قانونوں
کو برسوں پیچھے چھوڑ دیا تھا۔" [۲۸]

سنیل کمار رائے کے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل تھا کہ ایک بچہ پو کے مان کارڈ سے کھیلتا ہے، اس کا ذہن ان پو کے مان کے کرداروں کی حرکات سے زیادہ اور کیا سوچ سکتا ہے جس پر ریپ کا الزام لگایا گیا وہ بچہ پو کے مان کا دیوانہ ہے آخر کس سوچ کے تحت وہ اس حد تک گیا اور اس سے متعلق کچھ اور باتیں جو ذوقی نے ناول میں شامل کیں وہ تمام حقائق کو سامنے لاتی ہیں۔

ناول میں ایک کردار اسنیہہ کا ہے جو کہ اسنیل کمار رائے کی بیوی ہے، اسنیہہ کا کردار مثبت ہے جو بُرا دیکھ کر بھی اچھے کی امید میں جیتی ہے اس کے دونوں بچے گھر چھوڑ کے چلے جاتے ہیں پھر بھی وہ خود کو مطمئن رکھتی ہے، اسنیل کمار رائے کی نسبت اس کردار میں جذبات زیادہ نظر آتے ہیں وہ دُکھی بھی ہوتی ہے پر بچوں کی خوشی کے لئے جدید ماحول میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے وہ اپنے خاوند اور بچوں کو جوڑنا چاہتی ہے پر جو دراڑیں اس گھر میں پڑ چکی ہوتی ہیں انہیں ٹھیک کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس کردار کے خیالات کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

"اسنیہہ کا لہجہ تحکمانہ تھا_ بچے اُڑ رہے ہیں_ اور ان کے اڑنے کے لئے تمہارا یہ
آسمان چھوٹا پڑ گیا ہے انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دو مجھے دیکھو میں ماں ہوں تم سے
زیادہ مجھے ٹھیس لگنی چاہیے مگر_ شاید میں ڈر گئی ہوں۔" [۲۹]

اسینہہ نے سنیل کمار کی نسبت بچوں کو زیادہ اہمیت دی مگر آخر میں اس کے ہاتھ بھی خالی رہے، جن بچوں کی بات کو وہ زیادہ اہم گردانتی تھی وہی بچے اسے اکیلا چھوڑ کر اپنی اپنی دنیا میں نکل گئے اسینہہ کو جب احساس ہوا تب وہ خالی ہاتھ اور تہہ دامن تھی۔

"تم سچ کہتی ہو۔قبرستان۔ایک عمر آتی ہے جب ہم قبرستان میں ہی ہوتے ہیں_
اپنی عمر کے قبرستان میں_ جہاں بچے ہمیں اکیلا چھوڑ کر اُڑ چکے ہوتے ہیں اور بچتی
ہے قبرستان جیسی خاموشی۔" [۳۰]

اسینہہ کا کردار ایک جاندار کردار ہے، ایک ایسی عورت کا کردار جو جوان بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی دلکش نظر آتی ہے۔ بچوں کے چھوڑ جانے کے بعد بھی وہ زندگی کو روکتی نہیں بلکہ نئی زندگی کی شروعات کر دیتی ہے جس میں بچوں کی کمی تو محسوس ہوتی ہے مگر اتنی بھی نہیں کہ جینا چھوڑ دیا جائے۔

جئے چنگی رام_ عمر ۴۷ سال۔ ذات کا چمار _ ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاں ذات پات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے کوئی نیچی ذات کا ہے تو اس کا چھوا ہوا بھی کھانا حرام سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی معاشرے میں جئے چنگی رام نے آنکھ کھولی، اکثر اوقات اسے بھی دھتکارا جاتا جس کا اثر اس کے ذہن میں بیٹھ گیا۔ بچپن میں جب اس نے جگجیون رام کی سیاسی شہرت کو دیکھا جو کہ ذات کے چمار تھے تو اس کے دل میں بھی ویسا بننے کی خواہش جاگی، جگجیون بابو کے کہے ہوئے الفاظ میں اپنا مستقبل ڈھونڈتے ہوئے جئے چنگی رام بھی برابری کرنے کے لئے تعلیم کی طرف متوجہ ہوا تا کہ جگجیون رام جیسا بن سکے مگر اسے ہر جگہ ہتک کا احساس ہوتا، اسکول میں اسے ایسے سمجھا جاتا

جیسے وہ چھوت کی بیماری ہو۔

دسویں میں ہی اس کی شادی سمترا سے کر دی گئی مگر وہ اپنے سپنے کو نہ بھولا اور سب چھوڑ چھاڑ کر دلی چلا آیا وہاں اسے اپنے سپنے کو پورا کرنے کا موقع میسر آیا تو اس نے ذرا تعامل نہ کیا دلی میں اس نے شوبھا سے شادی کر لی جس سے سونالی نے جنم لیا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جے چنگی کو احساس ہو گیا کہ شوبھا اس سے وفادار نہیں اور سونالی بھی اس سے عقیدت نہیں رکھتی وہ ان دونوں ماں بیٹی سے جان چھڑانے کے چکر میں تھا کہ ایک دن وہ واقعہ ہو گیا جس نے جے چنگی کی خواہشات کو پر لگا دیئے اور وہ سگی بیٹی کی عزت کو پسِ پشت ڈال کر صرف سیاست کے لئے بیٹی کا استعمال کرنے پر اُتر آیا۔

"اب چناؤ سر پر تھا۔ پارٹی میں اس کی حیثیت کو لے کر وعدے نیارے بھی ہو رہے تھے
کہ اچانک یہ قصہ ہو گیا۔ اس وقت وہ گھر پر تھا۔ دو بجے تھے۔ جب سونالی روتی ہوئی آئی۔
اور روتے چیختے ہوئے اس نے سارا گھر آسمان پر اٹھا لیا۔" [۳۱]

اس حادثے سے جے چنگی کی لاٹری نکل آئی تھی، وہ ویسے بھی شوبھا اور سونالی سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا کیونکہ سمترا کے خط اسے ملا کرتے تھے، سمترا کے بَطن سے بھی اسے ایک بیٹی ملی تھی وہ جلد از جلد سمترا اور بیٹی کو اپنے پاس بلانا چاہتا تھا اسی لیے اُس نے شوبھا کے ہزار منع کرنے پر بھی پارٹی دفتر میں خبر کر دی اور ایف آئی آر درج کرا دی۔ سونالی کو اس نے باتوں میں بہلا پھسلا کر اپنے مقصد کے لیے تیار کر لیا تھا اور اب اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی اس نے سونالی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

نسوانی کرداروں میں دوسرا اہم کردار شوبھا کا سامنے آتا ہے جو اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر دُکھی نظر آتی ہے، زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ سیاسی پارٹیاں اور خود اس کا شوہر اس کی بیٹی کا استعمال کر رہا تھا اُسے سونالی کی بدنامی کا بہت دکھ ہوتا ہے مگر وہ کچھ کر نہیں پاتی کیونکہ سونالی ماں سے زیادہ باپ کی بات مانتی ہے۔ ایسے میں شوبھا صرف کڑھتی رہتی ہے کیونکہ اس کے بولنے سے نہ سونالی پر اثر ہوتا تھا اور نہ ہی جے چنگی رام پر۔

مرد کرداروں میں ایک کردار دیوورت کا ہے جو کہ ملزم بچے روی کنچن کا باپ ہوتا ہے، دیورت ایک بلڈنگ کنٹرکٹر تھا اسے اپنے کام کاج سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ بیٹے کی تربیت کرتا یا اسے اچھے برے کی تمیز سکھاتا۔

مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کے خیالات کی عکاسی کی جا سکتی ہے۔

" مگر دیوورت زیادہ چنتا نہیں کرتے تھے شام میں دارو کی بوتل چاہیے اے ون کلاس
وہسکی_ فرائی مچھلی اور چکن کے پیس_ دوست یاری میں سب چلتا ہے۔ وہ بھی

ایسے ہی پلے بڑھے ہیں روی بھی بڑھ جائے گا۔ "[۳۲]

جۓ چنگی رام کے مکان سے چار فرلانگ پر دیوورت کا مکان تھا، روی اور سونالی ایک ہی اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے یہی وجہ ہے کہ سونالی اکثر روی کے گھر جایا کرتی تھی اور اس حادثے کی وجہ بھی اسی بات کے پیچھے پوشیدہ تھی۔

ذوقی نے ضرورت کے پیش نظر کہیں کہیں مرقع نگاری بھی کی ہے، روی کنجن کا حلیہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"وہ اپنی عمر سے دو تین سال زیادہ کا نظر آتا تھا۔ بدن پر کافی گوشت تھا۔ یعنی اپنی عمر سے زیادہ ایک بھاری بھر کم جسم والا۔۔۔ " [۳۳]

ایک اور جگہ پر ان الفاظ میں حلیہ بیان کرتے ہیں۔

"میں نے ایک بار پھر بچے کا جائزہ لیا۔ وہ اچھا خاصہ فربہ تھا۔ بارہ سال کا بچہ۔ لیکن ویٹ ۲۵_۲۶ سے کم نہیں ہوگا یعنی۔ اپنی عمر سے دوگنا وزن۔۔۔ اس نے جینس پہن رکھی تھی۔ نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی جینس۔ پاؤں میں ریمنڈ کے جوتے تھے۔" [۳۴]

پرماکر بندھو جو کہ روی کنجن کے کیس میں اسنیل کمار رائے کے ساتھی تھے جن کو روی کے فیصلے کی لئے منتخب بورڈ میں شامل کیا گیا تھا ان کا حلیہ ملاحظہ کیجئے۔

"وہ چھوٹے قد کا تھا_ دبلا پتلا قد پانچ فٹ دو انچ سے زیادہ نہیں کُرتا پاجامہ پہنا تھا_ اوپر سے ایک صدری_ اس کی آنکھیں چھوٹی اور گول تھی۔" [۳۵]

بورڈ میں شامل خاتون ریتا بھاوے کے بارے میں ملاحظہ کیجئے۔

"وہ چھریرے بدن کی دبلی پتلی عورت تھی۔ عام طور پر سفید کھادی کی ساڑھی پہنتی تھی۔" [۳۶]

کرداروں کے حلیے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو بیان کرنا بھی ضروری ہوتا ہے ذوقی نے کرداروں کی ظاہری اور باطنی تصویر کشی کی ہے۔ ذوقی نے کرداروں کو ان کی صفات کے ساتھ پیش کیا ہے اور کرداروں کے حلیے بھی ان کے ماحول کے مطابق ہیں۔

ذوقی نے کرداروں کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کردار قاری کے سامنے چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔

ذوقی نے ناول میں منظر نگاری کو خاص جگہ دی ہے ان کے تمام ناولوں میں منظر نگاری کی گئی ہے زیر بحث ناول میں بھی وہی انداز تحریر اپناتے ہیں۔

"اس گھر میں میرا بھی ایک چیمبر ہے۔ چیمبر میں قانون کی موٹی موٹی کتابیں اور

ہر روز ڈاک سے آنے والی قانونی نکتوں پر مبنی رسائل کی بھیڑ جمع ہے۔اپنی موونگ
چیئر کرسی کے پاس ہی، دیوار پر میں نے ایک بڑا سا آئینہ لگا رکھا ہے۔" [۳۷]

بچوں کے لیے بنائے جانے والے ریفارم ہاؤسز کی خستہ مالی کا احوال ذوقی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔دیواروں سے رنگ وروغن غائب تھا۔ایک عورت
لکڑی کی کرسی پر بیٹھی ہوئی اسے زور زور سے کسی بات پر ڈانٹ رہی تھی۔" [۳۸]

منظر نگاری اور جذبات نگاری کو کسی بھی اچھے ناول کا خاص حصہ سمجھا جاتا ہے اس لئے مصنف کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ جس منظر کی تصویر کشی کرے اس کی تمام جزئیات کا علم رکھتا ہو اور اس خوبصورتی سے ان مناظر کو بیان کرے کہ ذہن فوراً متوجہ ہو جائے، ذوقی نے اس ناول میں بہت کم منظر نگاری کی ہے مگر بازار اور کورٹ کا منظر بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اُن کی منظر نگاری بہت جاندار ہے جس کا ثبوت ناولوں کے مطالعے سے مل جاتا ہے۔

عدالتی ماحول کی عکاسی ذوقی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے لوگ_ حیران پریشان_ مقدمے کی کارروائی
کا انتظار کرتے ہوئے_ پبلک پرازیکیوٹر اور ڈیفنس لائر اپنی اپنی جرح کے بعد واپس
اپنی جگہ لے چکے ہیں سب کی نگاہیں فیصلے پر ٹکی ہوئی ہیں ایک تاریخی فیصلہ۔ مجھے بھی
اس فیصلے کا احترام کرنا ہے اپنی طرف ہزاروں چبھتی ہوئی آنکھوں سے الگ کسی بھی فیصلے
تک پہنچنے سے پہلے۔۔۔" [۳۹]

ذوقی نے ناول میں مختصر اور جامع مکالمات کا سہارا لیا ہے مگر ناول کے آخری حصے میں فیصلے کو مختصر نہیں بیان کیا جاسکتا کیونکہ اس میں ان تمام برائیوں کا پردہ چاک کرنا تھا جو دھیرے دھیرے معاشرے میں جذب ہوتی جارہی ہیں جس کی ایک کڑی روی اور سونالی کا کیس بھی تھا، ذوقی نے طویل مکالمات سے یہ بات باور کروانی چاہی کے وقت کس رفتار سے بدل رہا ہے وقت کے ساتھ ساتھ تہذیب کا نوحہ بھی ان کی تحریروں میں شامل ہے انہوں نے تمام حقائق کو کرداروں کی زبانی ناول میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس ننے کردار روی کنچن کو ملزم کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔

ناول کا سب سے جاندار مکالمہ پیش خدمت ہے جس کے مطالعے سے جج سنیل کمار رائے کے خیالات کی عکاسی ہوتی ہے، جس نتیجے پر پہنچنے کے لیے وہ پورے ناول میں سرگرداں ہوتے ہیں اس کو بھی سمجھا جاسکتا ہے ملاحظہ کریں۔

"سزا کا اختیار مجھے نہیں ہے۔مجھے یہ کہنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔مگر یہ سچ ہے۔

ممکن ہے۔آپ میرے فیصلے کوایک پاگل جج کا فیصلہ یا کچھ بھی مان لیں۔۔۔ایسے
واقعات کا کوئی فیصلہ ہوسکتا ہے تو وہ بہر طور کرنے کا حق صرف اور صرف قدرت کا
فطرت کو ہے جس نے ڈائناسورس کی نسلیں تباہ کیں، آدمیوں کی نسل تباہ کرنا اس
کے لیے زیادہ دشوار نہیں۔" [۴۰]

ذوقی کے اسلوب بیان کی تعریف اکثر قدردان کیا کرتے ہیں اس ناول میں بھی انھوں نے ایک خوبصورت اسلوب کا سہارا لیا ہے جس کی وجہ سے ناول مزید جاذب نظر بن گیا ہے۔

سلمان بن رزاق اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

" آپ کا اسلوب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ کا اپنا ہے اور اس ناول میں بھی اس
اسلوب کو برتنے میں آپ نے پوری دلیری اور حوصلے سے کام لیا ہے۔" [۴۱]

ذوقی نے ایک حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے مگر اپنے قلم کو قابو میں رکھنے کا ہنر وہ جانتے ہیں، عریانیت کا سہارا نہیں لیا ہے۔

"پوکے مان کی دنیا" میں بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے مگر ناول کے آخری حصے میں فیصلے سے کچھ پہلے کے احوال ذوقی نے مرکزی کردار اسنیل کمار رائے کی ڈائری کے ذریعے سے قاری تک پہنچایا ہے جس میں روزمرہ کے واقعات کے علاوہ روی سے ملاقات کے احوال اور اس کردار میں در آنے والی وقتی تبدیلیوں کا اعتراف بھی نظر آتا ہے۔ ذوقی نے ڈائری کی تکنیک کا استعمال ناول کے اس حصے میں کر کے ناول کو جاذب نظر بنا دیا ہے۔

ذوقی کے ناولوں میں شعری زبان کا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے زیر بحث ناول کے اکثر ابواب کے ابتدائی کلمات کو انہوں نے شعری زبان دے کر اسلوب میں خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ دوسرے باب کی شروعات وہ ایسے کرتے ہیں۔

"ادھر اُدھر
آگے پیچھے/ دائیں بائیں۔۔۔
پوکے مان۔۔۔
ہوتے رہتے ہیں نئے نئے تماشے۔۔۔" [۴۲]

ایک باب کو وہ جنگلی پف کے نام سے ماخوز کرتے ہیں تو ساتھ میں اس پوکے مان کی خصوصیات اور ہیبت ناکی بھی بیان کرتے جاتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

"تیار رہیے

دھماکہ بس ہونے والا ہے

ہوسکتا ہے کہ۔۔۔

آپ کے چیتھڑے اڑ جائیں۔۔۔

آپ کو ساودھان رہنا ہے۔۔۔" [۴۳]

ذوقی نے جس خوبصورتی سے ناول کا اسلوب متعین کیا ہے وہ مجموعی طور پر ناول کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ جس میں خاص طور پر شعری زبان کا استعمال توجہ طلب ہے۔

"ایک گہرا سناٹا ہے۔۔۔

ایک چھوٹی سی کنکری پھینکو

کیا تم نے اس سے پہلے کبھی دیکھا ہے ۔

زلزلے کا منظر۔" [۴۴]

ذوقی نے اسلوب میں انگریزی کا استعمال بھی اکثر جگہوں پر کیا ہے پیچھے دیے گئے اقتباسات میں انگریزی الفاظ کا استعمال دیکھا جاسکتا ہے اور کہیں کہیں انہوں نے مکمل انگریزی اقتباسات بھی شامل کیے ہیں تا کہ کرداروں کی وضاحت ہو سکے۔

۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء ہندوستان ٹائمس کا اداریہ تھا۔

"Mars on the rocks

The Quest to find evidence of water on mars has

long been linked to the other question is there life

on the red planet?" [۴۶]

عدالت میں روی کے کیس کا فیصلہ سناتے وقت جو رپورٹ پڑھی جاتی ہے اس میں بھی انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔

"There is nothing special in this case, this case

does not hold water . " [۴۷]

انگریزی معنی خیز الفاظ کے استعمال سے ذوقی نے اسلوب میں نیا رنگ بھر دیا ہے۔

ناول کے آخری حصے کو ذوقی نے استعفٰی نامہ کا عنوان دیا ہے۔ یہ حصہ مشتمل ہے روی کنچن کے کیس کے فیصلے پر، جس میں عدالتی کارروائی کے بعد جج اسنیل کمار رائے سے وہ کیس لے لیا جاتا ہے بلکہ اس کیس کو سمجھنے کے بعد

اسنیل کمار کی ذہنی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ استعفیٰ نامہ جمع کروا دیتا ہے اس حصے میں ذوقی نے بے باکانہ زبان کا استعمال کیا ہے، انہوں نے ہمیشہ ہی غلط کو غلط کہا ہے ظالم سیاستدانوں اور کرپٹ لوگوں کے خلاف جب ہر طرف خاموشی ہوتی ہے تب بھی ذوقی اپنے قلم کو بند نہیں کرتے اور غیر جانبداری سے لکھتے ہیں۔ ناول کے آخری حصے میں ذوقی نے حقیقت کا پردہ فاش کر دیا ہے اور کھلے عام حقائق بیان کئے ہیں۔

اسنیل کمار رائے کی زبانی روی کے کیس کا فیصلہ ملاحظہ کریں جو کہ اس پورے ناول کا حاصل سمجھا جائے گا۔

"راوی کنچن بے قصور ہیں اور اس پورے معاملے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔۔۔
میں پورے ہوش و حواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند، دفعہ ۳۰۲ کے تحت _
میں اس نئی ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم
دیتا ہوں _ ہینگ ٹل ڈیتھ۔" [۴۸]

ذوقی نے ناول کو ایک کامیاب اختتام دیا ہے وہ ایک ایسے ناول نگار کے طور پر ابھرے ہیں جو ماضی اور حال کی نسبت مستقبل پر بھی آنکھ رکھتے ہیں، انہوں نے اس موضوع کو اپنا کر دنیائے ادب کو ایک نیا موڑ دیا ہے، فنی لحاظ سے بھی یہ ایک کامیاب ناول تصور کیا جائے گا۔

مشرف عالم ذوقی نے اس نئے موضوع کو زیر بحث لا کر ایک نئی راہ کھولی ہے، بلاشبہ یہ ناول "پوکے مان کی دنیا" اردو ناول کی تاریخ میں اپنی ایک منفرد پہچان بنا چکا ہے۔

پروفیسر ایس کی عجیب داستان

مشرف عالم ذوقی کی تحریروں میں آئے روز مستنصر حسین تارڑ کا ذکر آتا رہتا ہے، ذوقی کا قاری اس بات سے خوب واقف ہے کہ ذوقی اپنے دل میں اُن کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں، عصرِ حاضر کے لکھنے والوں میں وہ سب سے زیادہ متاثر تارڑ صاحب سے ہیں اس بات کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے زیرِ بحث ناول "پروفیسر ایس کی عجیب داستان" کا انتساب اُن کے نام ان عقیدت بھرے الفاظ میں کیا ہے۔

"اردو ناولوں کے بادشاہ مستنصر حسین تارڑ کے نام"

۲۰۰۵ء میں یہ ناول منظرِ عام پر آیا جو کہ عصر حاضر کی مذہبی، سیاسی وسماجی اور فکری ناانصافیوں کے خلاف احتجاج ہے۔ ذوقی نے اس ناول کے ذریعے موجودہ عہد میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کو موضوع گفتگو بنایا ہے خواہ وہ بدعنوانیاں سماجی، سیاسی ہوں یا پھر مذہبی۔

ناول کے پس منظر میں ۲۷ دسمبر ۲۰۰۴ء کا سونامی ہے جس کو ذوقی نے موضوع بحث بنا کر ہمیشہ کے لئے ناول میں قید کرلیا ہے انہوں نے سونامی کی قیامت خیز طوفانی لہروں کے ذریعے زندگی کا المیہ پیش کیا ہے۔

ناول کی ابتدا میں ہی ذوقی نے گابریل گارسیا مارکیز کے ناول "تنہائی کے سو سال" میں سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جو نہ صرف اُن کے وسیع مطالعے کا منہ بولتا ثبوت ہے بلکہ مارکیز کے ساتھ ان کے خاص لگاؤ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

ناول کے ابتدائی صفحات میں ہی انہوں نے قرآن پاک کی ایک آیت کو بھی ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔

"خشکی اور تری میں لوگوں کے عمل سے فساد برپا ہوگیا تا کہ اللہ انہیں ان کے بعض کرتوت کا مزہ چکھائے، ممکن ہے کہ وہ لوگ اپنے عمل سے باز آجائیں۔" [۴۹]

حسن عابدی کی نظم "سونامی" کو ناول کے ابتدائی صفحات کا حصہ بنا کر ذوقی نے قاری کے لئے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہیں سے قاری ناول کی سونامی لہروں کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔

۲۰۰۴ء میں پیش آنے والے سونامی حادثات نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا جس کی صاف تصویر ہمیں ذوقی کے اس ناول میں نظر آتی ہے، ناول کے باقی موضوعات کی طرف بڑھنے سے پہلے ۲۰۰۴ء کے سونامی حادثات پر نظر ڈالنا ضروری ہے جس کو پسِ منظر بنا کر اُن کے ذہن میں اس ناول کا خیال آیا۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سونامی ہے کیا؟

سونامی درحقیقت سمندر کے نیچے آنے والے زلزلوں سے پیدا ہونے والی لہروں کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ

ہے جو جاپانی زبان سے تعلق رکھتا ہے، زمین کے وجود میں آتے ہی اس میں تبدیلیوں کا عمل شروع ہو گیا انہی تبدیلیوں کی وجہ سے زمین کے بہت سے خشک حصے سمندر میں ڈوب گئے جس کے نتیجے میں بہت سے نئے سمندری جزائر وجود میں آئے۔ ماہرین ارضیات کے مطابق زمین کی یہ تبدیلیاں زلزلوں کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں، ہماری زمین پر سال بھر میں تقریباً بارہ ہزار زلزلے آتے ہیں جن میں سے بیشتر ہمیں محسوس ہی نہیں ہوتے جبکہ کم و بیش سو زلزلے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں اور ان میں سے ایک زلزلہ قیامت خیز ثابت ہوتا ہے انہی زلزلوں کے سبب سمندری لہریں بے قابو ہو کر کئی کئی شہروں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہیں۔

۲۰۰۴ء کی سونامی لہروں نے کئی ممالک کو اپنی زد میں لیا جبکہ زیادہ تباہ کاریاں انڈونیشیا، ملائشیا اور تھائی لینڈ، برما، بنگلہ دیش، سری لنکا اور بھارت میں برپا ہوئیں۔

بحر الکاہل میں اس طرح کے طوفان آتے رہتے ہیں جس کے لیے وہاں طوفان سے پہلے عوام کو خبردار کرنے کا نظام موجود ہے مگر بحر ہند میں اس طرح کا کوئی نظام موجود نہیں کیونکہ یہاں اس طرح کے طوفان عام طور پر نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ بحرِ ہند میں اس سونامی نے زیادہ نقصان پہنچایا، بحرِ ہند میں سونامی کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں کم از کم تین لاکھ افراد ہلاک ہوئے جبکہ لاکھوں افراد کے سر سے چھت چھن گئی۔

ذوقی نے ان تباہ کاریوں کو موضوع بنایا اور مکمل طور پر تفصیل بیان کی جس کی وجہ سے ناول کا وہ حصہ ایک سونامی رپورٹ کا منظر پیش کرتا ہے کیونکہ ذوقی نے یہاں زیادہ تر صحافتی انداز تحریر اپنایا ہے اور چونکہ سونامی کی تباہ کاریوں کا منظر مختصراً بیان کرنا محال تھا اس لئے ذوقی نے طویل اقتباسات کا سہارا لیا جس سے وقتی طور پر تو قاری کی اکتاہٹ میں اضافہ ہوتا ہے مگر موضوع کی مناسبت سے طویل اقتباسات کو ناول کا حصہ بنانا بھی ضروری تھا اگر وہ یہ اندازِ تحریر نہ اپناتے تو سونامی کی مناسبت سے یہ ناول کامیابی نہ حاصل کر پاتا اور سونامی کی تباہ کاریوں کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش آتی، ان تباہ کاریوں کے بیان کے لیے طویل اقتباسات کو شامل کیا گیا ہے مگر چند مختصر مندرجہ ذیل ہیں جن کے مطالعے سے ذوقی کے اندازِ تحریر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"دیکھتے ہی دیکھتے قیامت کا منظر۔ شائیں شائیں۔۔۔ ہاہاہا اور بھیانک آواز اور بھیانک
شور کے ساتھ سمندری لہریں اوپر اٹھنے لگیں۔ اور پانی کی اونچائی تاڑ جتنی ہو گئی۔ عجیب
منظر تھا۔ سبھی کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔" [۵۰]

"اپنے بچاؤ کی خاطر جس کو جو کچھ ہاتھ لگا۔ کھمبا، درخت، دیوار یا کھڑکی چاہے کچھ بھی،
سختی سے پکڑ کر کھینچ لیا۔۔۔ کتنی زندگیاں لہروں کا نوالہ بنیں۔ اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل

ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔سرکاری طور پر اندازے کے مطابق یہ تعداد کئی ہزار
ہوسکتی ہے۔" [۵۱]

"یہ اس صدی کا بڑا ہی خوفناک المیہ تھا۔کسی کو اس کی بھنک تک نہیں لگی۔کیا سے کیا
ہوگیا۔؟ سونامی ... یہ نام کتنا چھوٹا ہے لیکن اس کا کہرا اتنا ہی بھیانک خوفناک
اور لرزہ خیز۔" [۵۲]

ناول کے ابواب کی فہرست سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ذوقی نے قدرت کے کس ستم پر قلم اٹھایا ہے، بظاہر ناول کے پس پردہ ۲۰۰۴ء کی تباہ کن سونامی لہریں ہیں مگر ذوقی نے ان سونامی لہروں کی تباہ کاریوں کے پیچھے ایک اور کہانی بھی پیش کی ہے،انہوں نے سونامی لہروں کو مخفی لہروں کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک حصہ جہاں سونامی کی تباہ کاریوں کو موضوع بنا کر زندگی کا المیہ پیش کیا ہے وہیں دوسری طرف انہی سونامی لہروں کی پسِ پردہ ادب میں شامل ہونے والی سونامی لہروں کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

ذوقی نے اس ناول میں سونامی کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو انسانی تکدر اور اس کے شر کے نتیجے میں ایک حادثہ بن کر ابھرتی ہے،انہوں نے سونامی لہروں کے ذریعے ادب میں شامل ہونے والی خوفناک لہروں کو ناول کا حصہ بنا کر ناول کو جاذبِ نظر بنا دیا ہے،ناول میں اکثر ایسے واقعات کا ذکر ملتا ہے جس سے ادب کے زوال کا منظر پیش کیا گیا ہے،ناول کا ایک کردار "پروفیسر صدر الدین قریشی" جس کی دانشوری کی گواہی اس کے حریف بھی دیا کرتے تھے درحقیقت وہ کس ذہنیت کا انسان تھا ذوقی نے اس جیسے نقلی ادیبوں کا اصلی چہرہ بے نقاب کیا ہے،وہ کردار اپنی دولت کے دم پر ادیب خریدا کرتا اور ان سے وہی کچھ لکھواتا جو وہ لکھوانا چاہتا تھا،وہ ادیب اس کے زر خرید غلام تصور کیے جاتے جو اس کے اشاروں پر چلا کرتے اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے اس کردار کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"بھول جایئے۔میں آپ کو نام دوں گا۔ابھی کیا ہے آپ کے پاس۔قلم۔وہ بھی میرے
جیسا۔میں نے اس قلم سے نام،شہرت،پیشہ اور دنیا بنائی ہے۔نام میں دوں گا۔جینے بھر
کے لیے۔پیسہ بھی۔۔۔تو طے رہا موسو۔اب آپ کی زندگی آپ کی نہیں،میری ہے۔تو
اسے مجھے استعمال کرنے دیجیئے موسیو۔" [۵۳]

ذوقی نے اس ناول کے ذریعے سے اس پورے نظام کو بے نقاب کیا ہے جس کے زیرِ سایہ ادب کو عرصے سے کمزور کیا جاتا رہا ہے اس کی وضاحت پروفیسر ایس کے اس مکالمے سے ہوجاتی ہے۔

"یہاں شاہ پور چھولہ داری سے میں ادب کی دنیا میں نئے ہنگامے کرنے جا رہا ہوں۔
چارا سب کو ڈالنا ہے، سب کو شہرت چاہیے۔ سب اپنا نام جلی حروف میں دیکھنے کے
عادی ہیں اور ایک رسالہ۔ ایک خوبصورت رسالہ۔۔۔ وہ سارے جو میرے بارے
میں افواہیں پھیلا رہے ہیں سب میری اور تمہاری جھولی میں ہوں گے۔" [۵۴]

درحقیقت ذوقی نے اس ناول کے ذریعے اپنا احتجاج درج کرایا ہے، انہوں نے پروفیسر ایس کے کردار کا سہارا لے کر ادبی مافیہ کو بے نقاب کیا ہے، اس کے علاوہ انہوں نے کچھ واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جن سے وہ خود بھی وابسطہ رہے جیسے ای_ٹی_وی_ کا معاملہ اٹھایا گیا، رسالہ نکالنے کا حال بیان کیا گیا اور خانقاہی کے ناول لکھنے کو زیر بحث لایا گیا ہے، ان کی وجہ سے ذوقی کو کچھ اعتراضات کا بھی سامنا بھی کرنا پڑا مگر اُن کے اندر ہار مان لینے کا مادہ نہیں وہ جو بھی لکھتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر لکھتے ہیں۔

۲۰۰۴ء میں آنے والے سونامی کو لے کر ادب کی دنیا میں جو ہلچل مچی اس حوالے سے ذوقی نے یہ ناول لکھ کر اپنا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔

سونامی اور اس طرح کی ناگہانی آفات پر پروفیسر ایس کی شخصیت کا پردہ فاش کر کے ذوقی نے ان نام نہاد ادیبوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے جو ادب کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں اس حوالے سے ایک مکالمہ ملاحظہ کریں۔

"عراق کی جنگ کے بعد بھی تم ایسے ہی سنجیدہ تھے۔ جھٹ پٹ خانقاہی کو بلا کر ناول
لکھ ڈالا دوسرا ادب انعام میرے بس میں ہوتا تو تمہیں ہی ملتا۔ اب کیا۔ سونامی
پر کچھ لکھنے جا رہے ہو۔" [۵۵]

ایسے نام نہاد ادیبوں کی نظر میں ادب کے کیا معنی ہوتے ہیں وہ پروفیسر کے اس اقتباس کے مطالعے پر سمجھے جا سکتے ہیں ذوقی نے اس موضوع کو ناول میں شامل کرنے کی جرات بھی اس لیے کی ہے تا کہ وہ اس مافیا کو بے نقاب کر سکیں اور ادب میں آنے والی سونامی لہروں کو پیش کر سکیں۔

"لوگ سمجھتے ہیں ادب سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ انقلاب آتا ہے۔ تھوکتا ہوں
ایسے لوگوں کے دماغ پر۔ اس دنیا میں سیاست سے بھی زیادہ کوئی چیز بکتی ہے تو
وہ ادب ہے۔ رنڈی سے زیادہ ننگی اور گھناؤنی دنیا ہے یہ۔ ہمارے ادب کی
دنیا۔" [۵٦]

ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس سے ذوقی کے خیالات کی باریکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"ہم ایک مرتی ہوئی زبان کے ٹھیکیدار ہیں ایک مرتی ہوئی زبان اور اسی لئے

ہمیں پوجا جارہا ہے کہ اس مرتی ہوئی زبان کی باگ دوڑ برسوں سے ہمارے
ہاتھوں میں ہے۔ زرا نظر تو دوڑاؤ۔ پروفیسر کتنے لوگ ہیں۔۔۔" [۵۷]

ذوقی نے کرداروں کی زبان سے ایسے جملے ادا کروائے ہیں کہ وہ خود ایک دوسرے کی حقیقت بیان کر دیتے ہیں۔ اس کھیل میں کوئی بھی دودھ کا دھلا ہوا نہیں سب ایک ہی کشتی کے مسافر ہیں، دو کرداروں کی زبانی وہ جس کڑوے سچ کو بیان کرتے ہیں۔

اس کا مختصر احوال اس اقتباس میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

"تو نگار صاحبہ۔ یہ مت بھولیے کہ آپ بھی دودھ کی دُھلی نہیں ہیں۔ لٹیرا میں ہوں
تو آپ بھی لٹیری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری لوٹ سب دیکھ رہے ہیں اور
آپ کی لوٹ سے کوئی واقف نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں سب سے کھاتا ہوں
۔۔۔غیرت آپ میں ہے نہ مجھے۔۔۔" [۵۸]

ذوقی نے اس ناول کی بُنت میں خاص مہارت سے کام لیا ہے اور تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک کامیاب ناول ترتیب دیا ہے، وہ ایک نڈر مصنف ہیں جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں بے باکانہ اور غیر جانبداری سے لکھتے ہیں زیرِ نظر ناول کے ذریعے انھوں نے موجودہ عہد میں پھیلی ہوئی ادبی، سیاسی اور اخلاقی بدعنوانیوں کو کھل کر بیان کیا ہے جس کی مثال کم دیکھنے کو ملتی ہے، سونامی لہروں کے بطون سے انہوں نے "پروفیسر ایس کی عجیب داستان" کو جنم دیا ہے۔

پروفیسر جو خود کو افضل تصور کیا کرتا تھا، جو کبھی زندگی میں موت کے خوف سے نہیں کانپا مگر سونامی سے تباہ شدہ علاقوں کے دورے کے دوران وہ بھی خوفزدہ ہو گیا، لاکھوں کی تعداد میں مرنے والے اشرف المخلوقات کو دیکھ کر مشکل سے وہ اپنے حواس پر قابو پا سکا، اس حوالے سے ذوقی نے اس کردار کی حالتِ زار کو ان الفاظ کا سہارا لے کر بیان کیا۔

"تمہاری حیثیت کیا ہے۔ ایک کیڑے سے زیادہ۔ حقیر کیڑے سے زیادہ۔
جسے ایک معمولی زمین کا جھٹکا، یا ایک معمولی سمندر کی لہر بھی توڑ کر رکھ دیتی
ہے۔" [۵۹]

موت کا وہ خیال جو سونامی علاقوں کے دورے کے دوران پروفیسر پر غالب آتا ہے وہ اس کی خانقاہ میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

"پروفیسر کو اچانک احساس ہوا سمندر کا ایک ایسا ہی تیز ریلا اچانک خانقاہ میں داخل
ہو گیا ہے اور یہ ریلا اسے اڑا کر بہا کر دور لے جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔

دراصل ہم حقیر کیڑے ہوتے ہیں اور قدرت کے ہاتھوں میں ہوتا ہے ریموٹ۔
بٹن آف۔اور صفحۂ ہستی پر اندھیرا اچھیل جاتا ہے۔" [۶۰]

ذوقی نے سونامی سے متاثرہ علاقوں کا حال دو کرداروں پرویز سانیال اور پروفیسر ایس کی زبانی بیان کیا ہے جو کہ متاثرہ علاقوں کا دورہ کرتے ہیں وہاں ان کی مختلف لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں زیادہ تر لوگ متاثرین میں شمار کئے جائیں گے اور کچھ امدادی کاروائی کے اراکین بھی تھے،ان لوگوں سے ہونے والی ملاقاتوں کا احوال بھی ذوقی نے ناول میں بیان کیا ہے تاکہ متاثرین کے جذبات کی بھی عکاسی ہو سکے جن کے اپنے پیاروں کو سونامی لہریں بہا کر لے گئیں،جن کے سروں سے چھت چھن گئی تھی۔ایسے کئی کردار سامنے آتے ہیں جنھوں نے سونامی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا مگر طویل اقتباسات ہونے کی وجہ سے یہاں شامل نہیں کیے جا سکتے۔

ذوقی نے ایک اور پہلو پر بھی نظر ثانی کی ہے اور ایسے مکالموں کو ناول کا حصہ بنایا ہے جن سے وہ ان تمام نظریات کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کمیونسٹ اراکین کے ہوتے ہیں،اس طرح کی تحریکوں سے ملک اندرونی طور پر جن مشکلات کا شکار ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کرنا ہی اصل میں ان کا اس پہلو پر بات کرنے کا مقصد تھا جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوتی ہے۔

ایسی تحریکوں کے باشندے معصوم لوگوں کو بہلا پھسلا کر اپنے کارندے بنا لیتے ہیں اور پھر ان سے اپنی مرضی کے کام لیا کرتے ہیں۔

ناول کے ایک کردار "احمد علی" کے ذریعے ذوقی نے اس حقیقت کو بیان کرنے کی جسارت کی ہے کہ کیسے حالات سے تنگ ایک انسان جو صرف اچھی زندگی گزارنے کی غرض سے،محنت مزدوری کے لیے ایک بڑے شہر میں قدم رکھتا ہے اور کیسے دو پل میں مختلف گروپوں کے ہتھیارے اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیتے ہیں اس کی وضاحت کے لیے یہ مختصر جملہ کافی ہوگا ملاحظہ کریں۔

"ٹفن پہنچانے والا آدمی احمد علی تھا۔لیکن دو نئے دوستوں کے ساتھ باہر جانے
والا آدمی مرڈر احمد علی تھا۔" [۶۱]

ذوقی نے ناول کے ابتدائی حصے میں اکثر جگہوں پر کرداروں کی زبان سے سخت کلمات ادا کروائے ہیں جس کی وجہ حقائق کو سامنے لانا ہے کیونکہ ذوقی غلط کو بیان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں انہوں نے سچ پر مبنی جو حقیقت نگاری کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ذوقی نے ان تمام انقلابیوں کا پردہ فاش کیا ہے جو انقلاب کے نام پر کاروبار کرتے ہیں،یہاں بھی وہ طویل اقتباسات

کا سہارا لیتے ہیں مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"اب لگتا ہے تم نے کسی بھی کرانتی یا انقلاب کو سامنے رکھ کر اپنی تحریک یا آندولن کے بارے میں سوچا ہوتا تو آج یہ نتیجہ نہ نکلتا۔۔۔انقلاب کے بعد کی غلطیوں اور جرائم کے لیے تمہارا دم پنتھ یا کمیونزم ذمہ دار ہے۔۔۔تمہاری غلط تحریک اور کمزور آندولن نے ایک مرت سرکار یا نکمی سرکار کو جنم دیا ہے۔۔۔" [۶۲]

مشرف عالم ذوقی لکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں ان کے جیسی بے با کی اور راست گوئی سب کے نصیب میں نہیں ہوتی۔

"پروفیسر ایس کی عجیب داستان" میں توہم پرستی کو بھی انہوں نے بیان کیا ہے خاص طور پر پروفیسر ایس کی شاہ پور میں آمد کے بعد شاہ پور پر جو مصیبتیں آئیں مقامی لوگوں نے ان تمام مصیبتوں کی وجہ پروفیسر ایس کو گردانا جن میں ایک وبا "لال ڈار کا آتنگ" بھی تھی جس نے کئی لوگوں کو نگل لیا ان لوگوں میں ایک بوڑھا ڈاکٹر اجے بھی تھا جس کی زبانی ذوقی نے پروفیسر کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ قاری تک پہنچائے۔

" گدھ۔آسمان پر گدھ چھا گئے ہیں۔خونی گدھ۔شاہ پور چھولہ داری میں کوئی نہیں بچے گا۔۔۔اسی پروفیسر کی وجہ سے۔جس دن وہ یہاں آیا تھا،اس نے اس مقدس شہر پر نحوست کا سایہ ڈال دیا تھا۔دیکھنا کوئی نہیں بچے گا۔کوئی نہیں بچے گا۔" [۶۳]

ناول کے اختتام پر ذوقی نے جو مکالمات پرویز سانیال اور سیما کی زبانی قاری تک پہنچائے ہیں وہ جاذبِ نظر ہیں اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں ذوقی نے پرویز سانیال کی زبانی اپنے خیالات کو قاری تک پہنچایا ہے۔

"سونامی لہریں بھر آئیں گی۔۔۔کسی بھی روپ، کسی بھی شکل میں، جب گناہ بڑھتے ہیں موسیو۔جب جرائم ہماری زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔۔۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی بھی پیشن گوئی ان لہروں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔۔۔ابھی بہت زیادہ مسکرانے کی ضرورت نہیں ہے موسیو۔۔۔سنامی کبھی بھی آسکتی ہے۔" [۶۴]

اس کے مطالعے سے ذوقی کی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جس کی پیشن گوئی انہوں نے اس ناول میں کی ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے کہانی کے ایک جاندار کردار احمد علی کی زبان سے اللہ تعالیٰ سے جو شکوے بیان کروائے ہیں وہ جاذبِ نظر ہیں مثال ملاحظہ کریں۔

"وہ کافی تڑپا۔کافی رویا۔اللہ کے حضور میں فریاد کی۔غصہ بھی ہوا۔اللہ میاں

تم نہیں ہو۔یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تم نہیں ہو۔۔۔اب میں تمہیں
یاد نہیں کروں گا۔میں تمہیں دھیرے دھیرے بھول جاؤں گا۔" [٦٥]

ایک طرف احمد علی کفریہ کلمات اپنے منہ سے نکالتا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی ہر مشکل گھڑی میں اللّٰہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدے کر رہا ہوتا ہے وہ چاہ کر بھی اس نصیحت سے چھٹکارا نہیں پا سکتا جو اس کے باپ نے جاتے ہوئے کی تھی کہ کبھی رب کی ذات سے مایوس نہیں ہونا، ہر مشکل کے پیش آتے ہی وہ سب ناراضگی بھول کر اللہ تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے۔

"رب العزت سے کبھی مایوس مت ہونا۔وہی دے گا۔وہی امید کی آخری کرن ہے۔
کبھی مانگنا ہو تو رب سے مانگنا۔" [٦٦]

مشکل کے پیش آتے ہی احمد علی میں ایک سچا مسلمان نکل کر سامنے آجاتا جو ہر تکلیف اور خوشی میں خدا کا ذکر لازمی کرتا۔ ناول میں سے چند اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"نیند اب بھی دور تھی۔جبکہ پپوٹے کافی بھاری لگ رہے تھے۔۔۔آنکھوں سے نیند دور
ہوتی جھٹ کلمہ پڑھنا شروع کر دیتا۔اس بار بھی احمد علی نے یہی کیا۔۔۔لا الہ الا اللّٰہ ...
محمد الرسول اللّٰہ ...یا اللّٰہ مجھے ہدایت دے۔مجھے اپنے راستے پر چلا۔مجھے سکون
دے مجھے نیند دے۔" [٦٧]

"ایک لطیف خیال کے تحت وہ مسکرایا۔دیکھا کامریڈ۔تم جب بھی پریشان ہوتے ہو۔
اللّٰہ تمہاری مدد کرنے آجاتا ہے۔بے آسرا ہوتے ہو تو اللّٰہ تمہیں اپنے گھر میں آسرا
دے دیتا ہے اور کہو کامریڈ۔تمہیں اللہ سے اور کیا چاہیے ___!" [٦٨]

ذوقی نے اس ناول میں مذہبی خیالات کو بار بار شامل کیا ان کے باقی ناولوں کی نسبت اس ناول میں مذہب پر زیادہ بات کی گئی ہے، ایک طرف تو احمد علی کی مذہب پرستی کو بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف پروفیسر ایس کی مذہبی بیگانگیت کو بھی ناول کا حصہ بنایا گیا ہے، پروفیسر کی زندگی میں مذہب کا کس حد تک عمل دخل ہے اُس کے مذہبی خیالات کی عکاسی پروفیسر کے مکالموں کے مطالعے سے ہو جاتی ہے۔

پروفیسر شاہ پور کے گرجا گھر کے پادری کیڈلک سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے، ذوقی نے ناول کے اس حصے میں بائبل کے طویل اقتباسات کو بھی شامل کیا ہے، ظاہری طور پر پادری کیڈلک کے الفاظ نے پروفیسر پر گہرا اثر بھی چھوڑا۔

" آسمان، آوازیں، فرشتہ، عذاب ... پروفیسر ایس کا سر تعظیم اور عقیدت سے جھک
گیا۔آنکھیں بند... آنکھوں کے آگے سیاہ بادل کے ٹکڑے لہرائے۔۔۔وہ مقدس
آیات [illegible] میں ڈوبتا ابھرتا ہوا معنی تک پہنچنے کا خواہش مند تھا

آہ لفظ میں سچ مچ طاقت ہے۔۔۔ پروفیسر کو احساس ہوا شاید اس

کی شخصیت بدل گئی ہے۔" [۶۹]

ناول کا باقاعدہ آغاز ذوقی نے "ایک قتل واجب کے لیے" کے عنوان سے کیا ہے جس میں دو لوگوں کے درمیان قتل سے متعلق مکالمہ ہو رہا ہوتا ہے یہی دو کردار آگے پیش آنے والی کہانی کا تانا بنتے ہیں مگر ناول کا مکمل مطالعہ کرنے تک قاری کے لیے تشنگی باقی رہتی ہے کہ آخر ان ابتدائی صفحات کو کہاں جوڑا جا سکتا ہے مگر ناول کے مکمل ہوتے ہی قاری کے سامنے سب بکھری ہوئی کڑیاں جڑنے لگتی ہیں۔

۵۱۹ صفحات پر مشتمل یہ ناول ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا جو درحقیقت موجودہ عہد کی بے راہ رویوں کا ترجمان ہے۔ ناول کے پسِ منظر میں دو کہانیاں چلتی ہیں ایک احمد علی کی زندگی کی ترجمانی کرتی ہے جو اس نے اپنی جدوجہد کے دوران کلکتہ میں نکسل تحریک کے زیرِ سایہ گزاری اور دوسرا حصہ کہانی کے مرکزی کردار پروفیسر صدرالدین پرویز کا ہے، بظاہر ان دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ خاص ربط نہیں نظر آتا ہے مگر احمد علی اور آدیتی سانیال کی اکلوتی اولاد پرویز سانیال کی زبانی پروفیسر ایس کی عجیب داستان قاری تک پہنچتی ہے۔

پروفیسر ایس نام کے آدمی نے پرویز سانیال کے گھرانے میں جو کردار ادا کیا اور چونکہ پرویز سانیال بھی اس کہانی کا اہم کردار ہے اس لئے دونوں میں ربط پیدا ہو جاتا ہے۔

ابتدائی طور پر قاری اسی خیال میں ہوتا ہے کہ ناول میں سونامی لہروں کی تباہ کاریاں بیان کی گئی ہوں گی، سونامی کے ذریعے ہونے والے نقصانات کا جائزہ لیا گیا ہوگا مگر ذوقی نے اندازِ بیاں مختلف اپنایا، ناول کی ابتداء کلکتہ کی زمین سے ہوتی ہے جہاں بہار سے تعلق رکھنے والا نوجوان احمد علی سوتیلی ماں سے چھٹکارا اور زندگی میں کچھ نیا کرنے کا خواب لے کر آتا ہے مگر وہاں وہ کامریڈ احمد علی بن جاتا ہے، احمد علی کی زبانی ذوقی نے نکسل تحریک کو منظرِ عام پر لانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

احمد علی ایک ایسا کردار ہے جس کے اندر ایک عجیب کشمکش ہمیشہ چلتی رہتی ہے وہ کامریڈ تو بن جاتا ہے مگر اس کے خیالات مختلف رہتے ہیں، کلکتہ میں قدم رکھتے ہیں اسے سندیپ سانیال کا ساتھ ملتا ہے جو کمیونسٹ سسٹم چلانے والے ایک گروہ کا سربراہ ہوتا ہے۔

احمد علی کا کردار ایک جاندار کردار ہے جو سچ بولنے کا حوصلہ رکھتا ہے، ایسے کردار بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں وہ مضبوط انسان ہونے کے ناطے غلط کرنے کا سوچتا ضرور ہے مگر کرتا نہیں، اسے ایک قتل کی ذمہ داری دی جاتی ہے مگر وہ اُلٹا کمیونسٹ ارکان کا بھروسہ توڑ دیتا ہے کیونکہ درحقیقت اس کو اس تحریک میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی

اور مقصد کے تحت سندیب سانیال کا گھر چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوتا، اس مجبوری کا نام تھا آدیتی سانیال وہ ادیتی کے بغیر کہیں جانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا آخر کار وہ ادیتی سے بیاہ کر کے دلی روانہ ہو جاتا ہے جہاں وہ ادیتی سے محبت کا ثبوت ایسے دیتا ہے کہ اپنے نام کے آگے ادیتی کا نام شامل کر لیتا ہے اور یوں وہ احمد علی سے احمد سانیال بن جاتا ہے، دلی میں وہ اپنا گھر بناتا ہے جہاں وہ دونوں اور ایک ان کے پیار کی نشانی پرویز سانیال ہوتا ہے، وہاں وہ تب تک ایک خوشحال زندگی گزارتے ہیں جب تک پروفیسر صدرالدین پرویز ان کی زندگی میں داخل نہیں ہوتا۔

احمد علی ایک ایسا کردار ہے جو خدا سے شکوہ کرتا ہوا نظر آتا ہے مگر وہ چھوٹی بڑی مشکل میں جائے نماز بچھا کر بیٹھ جاتا ہے، وہ مذہب سے دور بھاگنا چاہتا ہے پر بھاگ نہیں پاتا، اس کے دل میں مذہب سویا ہوا ضرور ہوتا ہے پر مرا نہیں ہوتا جو اسے ہر غلط خیال پر شرمندہ کر کے رکھ دیتا ہے، یہی مذہب سے لگاؤ اسے کامریڈ نہیں بننے دیتا، وہ کاروبار میں نام بناتا ہے، یہ کردار متاثر کرنے والا ہے اس کردار میں یکسانیت نہیں نظر آتی ہے، ذوقی نے اس میں مختلف رنگ بھر دیئے ہیں ہر بار وہ ایک الگ روپ میں سامنے آتا ہے کبھی وہ ایک بیروزگار کے حالاتِ زندگی کی مشکلات کو بیان کر رہا ہوتا ہے تو کبھی وہ کامریڈ بننے کی کوشش میں سرگرداں ہوتا ہے مگر اس کے خیالات کمیونسٹ نہیں ہوتے، تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ناکام ہو جاتا ہے، وہ ایک مذہبی آدمی کے روپ میں سامنے آتا ہے اور ناول کے دوسرے حصے میں ایک اچھا باپ بننے کے لیے دن رات محنت مزدوری کو ترجیح دیتا ہے، آخری حصے میں اپنے غلط فیصلے پر ایک جذباتی باپ بن کر سامنے آتا ہے۔

ان مختلف رنگوں کی بنا پر ہی ذوقی کے اس کردار کو ناول میں خاص اہمیت حاصل ہے، انہوں نے اس کردار کو اتنے رنگوں میں رنگ دیا ہے کہ اب یہ کردار سونامی کی ہی ایک یادگار معلوم ہوتا ہے۔

یہ کردار سب سے زیادہ مضبوط کردار ہے اور باقی کرداروں پر بھی بھاری پڑتا ہے احمد علی نے انسان کو اللہ تعالی کی ایک خاص مخلوق کے طور پر قبول کیا یہی وجہ ہے کہ جب کامریڈ سندیپ سانیال اسے ایک قتل کا کہتا ہے تو احمد علی ان کے منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے وہ خود کو اس جرم کی دنیا سے الگ کر کے اللہ سے لو لگا لیتا ہے اس اقتباس سے احمد علی کے خیالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> "اور یقیناً وہ اچھا آدمی ہے احمد علی کو یقین تھا اشرف المخلوقات خدا کی پیدا کردہ سب سے
> اچھی مخلوق کانوں میں ادیتی کا چہرہ لہرایا جو پیار کرتے ہیں وہ کسی کی ہتیا نہیں کر سکتے_
> یقیناً میرے لئے یہ دکھ دینے والی بات ہوگی کہ کسی نے میرے لیے_ میرے نام پر

کسی کی ہتیا کی تھی۔" [۷۰]

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ احمد علی ایک مضبوط کردار ہے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں پچھتاوے کا شکار ضرور ہوتا ہے، اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پروفیسر کے سپرد کر کے نہ صرف اس کا بچپن چھینا بلکہ اس کی جوانی بھی پروفیسر کی نظر ہوتی جا رہی تھی مگر وہ نا امید پھر بھی نہیں ہوتا یہ کردار ہار ماننے والا کردار ہے ہی نہیں، ذوقی نے اس کردار کے ذریعے ایک مضبوط انسان کا نقشہ پیش کیا ہے، ایک ایسا انسان جسے اُس وقت بھی کسی کا کوئی خوف نہیں ہوتا جب وہ موت کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے۔
اپنی موت کی رات وہ اندر سے ٹوٹ گیا جب اس نے اپنی اکلوتی اولاد کے چہرے پر ویرانی دیکھی پرویز کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا اور پروفیسر کے گھر پہنچ کر اسے برا بھلا کہنے لگا وہ رات احمد علی کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی وہ سویا تو پھر اٹھ نہ پایا۔
اس ناول کے نسوانی کرداروں میں دو کردار سامنے آتے ہیں، ایک ادیتی سانیال اور دوسری سیما۔
ادیتی سانیال جو ایک عام سی بنگلہ لڑکی ہے، عام لڑکیوں کی طرح وہ بنگالی گانے گاتی نظر آتی ہے، محبت کرتی ہے تو اس کے لئے ڈٹ کر سامنے آتی ہے مگر وہ اپنے بیٹے کے لیے فیصلہ کا اختیار احمد علی کے سپرد کر دیتی ہے جس وجہ سے وہ بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے ترستی رہتی ہے اور بلآخر ایک دن موت کو گلے لگا لیتی ہے۔
دوسری طرف اگر سیما کا کردار دیکھا جائے تو ابتدائی طور پر وہ ایک معصوم لڑکی کے روپ میں سامنے آتی ہے جسے پروفیسر صرف اپنی جسمانی تسکین کے لیے نکاح کر کے گھر لاتا ہے، دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا کہ خرید کے لاتا ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی زندگی میں آنے والی گزشتہ عورتوں کی طرح سیما سے بھی بیزار ہو جاتا ہے جبکہ دوسری طرف سیما کے دل میں پرویز کے لیے محبت جاگنے لگتی ہے، یہی محبت سیما کو اتنا بہادر بنا دیتی ہے کہ وہ اس سکندر اعظم جیسی شخصیت کے مالک پروفیسر ایس کو مات دے کر موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔
ادیتی سانیال کی نسبت یہ کردار زیادہ اہم ہے۔
سیما جو ڈری سہمی اور پروفیسر کی ہاں میں ہاں ملانے والی تھی ایک دم سے اس میں اتنی طاقت آ گئی کہ وہ بغیر کسی خوف وڈر کے پرویز کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتی ہے بلکہ پروفیسر کی دردناک موت کا انتخاب بھی وہ خود کرتی ہے، پرویز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سیما اپنے دل میں پروفیسر کے لئے اُس سے بھی زیادہ نفرت چھپا کر بیٹھی تھی اور جہاں پرویز، پروفیسر سے آزاد ہونے کے لیے بے تاب تھا وہیں سیما کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں آگ ضرور چھپی ہوئی تھی جسے وہ وقت آنے پر باہر نکالتی ہے تو پرویز کے لئے سیما جیسی معصوم لڑکی کا ایسا روپ

بہت انوکھا تھا۔

"وہ لڑکی جو برسوں سے ایک قیدی کی طرح، خوف سے سہمے ہوئے میمنے کی طرح
خانقاہ کے کھونٹے سے باندھ دی گئی تھی، آج اچانک اُس میں ایک انقلابی عورت
آ گئی تھی۔" [۱۷]

ناول میں ویسے تو کئی کردار ہیں جو ناول کو جاذبِ نظر بناتے ہیں مگر وقت اصل ہیرو کہلانے کا حقدار ہے، وقت جو طوفانی سونامی لہروں کی طرح ہمارے معاشرے کی تہذیب و ثقافت اور ہماری قدروں کو بہالے جاتا ہے اور اپنے پیچھے ایک بدنما، فریبی، دغا باز اور مکروہ سماج چھوڑ جاتا ہے ذوقی نے جہاں سونامی کی تباہ کاریوں کو بیان کیا ہے وہیں وہ سونامی کو علامت کے طور پر استعمال کر کے بدلتے وقت کا بھانک چہرہ بھی پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر ایس ایک ایسا کردار ہے جس نے پیسے کے بلبوتے پر لوگوں کو اپنا غلام بنایا، وہ جس انسان پر انگلی رکھتا اُسے تمام زندگی کے لیے خرید لیتا اور اپنا خادم بنا کر رکھتا، ناول میں ایسے کچھ کرداروں کے حوالے بھی ملتے ہیں جو کسی نہ کسی مجبوری کے تحت پروفیسر کی غلامی کر رہے تھے اور خاص طور پر ادب کے حوالے سے جو سچائی اس کردار کے ذریعے ذوقی نے بیان کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

پروفیسر صدرالدین قریشی کرائے کے ادیبوں کا مالک ہوتا ہے وہ انہیں اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے، اس سارے سسٹم کے پیچھے ان لوگوں کے جو مقاصد چھپے ہوتے ہیں اس کی عکاسی ذوقی نے پروفیسر ایس کے ذریعہ سے کر دی ہے۔

پروفیسر ایس اس بھیڑ بھاڑ کی دنیا سے دور شاہ پور میں ایک خانقاہ کا انتخاب کرتا ہے جہاں وہ ایک کم سن لڑکی سیما سے اپنے جسم کی تسکین کے لیے شادی کر کے خانقاہ میں ہی قیام کرتا ہے جہاں اسے یہ خیال اکثر ستایا کرتا کہ وہ ختم ہو رہا ہے تو اس کے خیالات کو بھی ختم ہونا پڑے گا، اسے ایک ایسے قالب کی ضرورت تھی جسے وہ اپنا آپ سونپ سکتا، وہ خود کو کسی اور کے اندر ڈالنا چاہتا تھا اور خود کا ایک کلون بنانا چاہتا تھا، ذوقی نے پروفیسر ایس کی اس نفسیاتی پیچ کو ناول میں بیان کر کے اس کی نفسیاتی خواہش کا صرف مذاق ہی نہیں اڑایا بلکہ اس ذہنیت کے لوگوں کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔

پروفیسر ایس کا کردار ایک جھوٹے، مکار اور فریبی شخص کا کردار ہے جو غرور اور تکبر کی چادر میں لپٹا ہوا ہے اس کے نزدیک عورت صرف جنسی ضرورت کو پورا کرنے والی ایک چیز ہے، اس کے نزدیک محبت ایک فضول چیز ہے، وہ محبت اور محبت کرنے والوں سے نفرت کرتا ہے، پرویز سانیال سے وہ ایسے مکالمے کرتا ہے جہاں وہ اسے بھی اپنی

سوچ کے مطابق چلانے کی کوشش کرتا ہے وہ پرویز سانیال کو اپنے جیسا بنانے کے لیے اس میں سے بھی محبت کے جذبے کو ختم کرنا چاہتا ہے، اسے وہ یہ سبق بار بار سناتا ہے کہ محبت کمزور لوگوں کا کام ہے، محبت کمزوری کی علامت ہے جو زندہ آنکھوں سے دیکھنے کی قوت چھین لیتی ہے۔

اس کردار نے ہمیشہ سچ سے منہ چھپایا ہے، اُس نے خود کو فریب کے لبارے میں چھپا رکھا تھا، ظاہری طور پر وہ ایک مضبوط کردار نظر آتا ہے مگر اندر سے وہ ذہنی بیماریوں کا شکار ہوتا ہے جس کی طرف ذوقی ابتدائی ابواب میں ہی اشارہ کر دیتے ہیں، ایسی ہی ایک ذہنی بیماری کے ذریعے پرویز سانیال اور سیما پروفیسر کو بھیانک موت تک پہنچاتے ہیں۔

"پروفیسر کو ہمیشہ سے بند کمرے سے گھٹن محسوس ہوئی ہے۔ مبادا وہ ایسی کسی چیز کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جو اس کے قیمتی وجود کو کسی تہہ خانے میں قید کر دے اس وقت تک اس حیرت انگیز بیماری کا شکار ہو چکا تھا۔۔۔ جس سے اس عجیب داستان کی کڑیاں بھی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔" [۷۲]

پروفیسر ایس کے کردار کو سمجھنا ایک عام قاری کے لیے مشکل مرحلہ ہے وہ عام انسانوں کی نسبت مختلف سوچتا ہے، اس کی نفسیاتی خواہشات عام انسانوں کی نسبت مختلف ہیں ایک نفسیاتی خواہش کا اظہار وہ ناول میں مندرجہ ذیل الفاظ کے ذریعہ کرتا ہے۔

"تو طے ہیں موسیو اور یقیناً میں نے سوچ لیا ہے مجھے ماضی سے نہیں، حال اور مستقبل کی کہکشاں سے واسطہ رکھنا ہے آ.ہ کہکشاں یقیناً موسیو میرے راستے میں۔۔۔ مجھے ایک نئے قالب کی ضرورت ہے۔ جسے میں ایک نئے سانچے میں ڈھال سکوں جس کے قلب کو میں اپنی روح سے منور کر سکوں آہ موسیو کوئی ایسا نوخیز جسم۔ نوخیز دماغ _ "[۷۳]

پروفیسر ایک نئے قلب کو اپنا کلون بنانا چاہتا تھا جو اسے پرویز سانیال کی صورت میں مل گیا، اس کردار کی ذہنی الجھنوں کو بہت خوبصورت طریقے سے ناول میں بیان کر کے اس کردار کی عکاسی کی گئی ہے، اُس کے اندر سکندرِ اعظم جیسی شان اور بلا کی خود اعتمادی تھی، انداز اور رہن سہن بھی شاہانہ تھا، اس کی دماغی کیفیت کا اندازہ اس مکالمے سے لگایا جا سکتا ہے۔

"مولانا_ آپ کو پتہ ہے تاج محل بنانے والے کاریگروں کے ساتھ۔۔۔ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تھے۔۔۔ قیصر الجعفری کا لہجہ کمزور تھا۔۔۔ میری تصویریں

کے بعد آپ پینٹنگ کرنا چھوڑ دیں گے۔" [۷۴]

پروفیسر ایس نہ صرف ذہنی طور پر کمزور تھا بلکہ وہ جنسی کمزوری کا بھی شکار تھا، اُس کے نزدیک عورت صرف ایک جسم ہے اور کچھ نہیں۔

ذوقی نے خوب بے باکی سے پروفیسر کا پردہ فاش کیا ہے جس میں کہیں کہیں وہ عریاں نگاری کا شکار بھی ہوتے ہیں مگر اس کے بغیر پروفیسر کے کردار کی عکاسی نہیں ہوسکتی تھی۔

"مجھے عورتیں ایک مخصوص عمر کے بعد اچھی نہیں لگتیں یہ میری کمزوری ہے ایک مخصوص عمر_ بدن ڈھلنے سے پہلے ہی میں انہیں پنجرے سے آزاد کر دیتا ہوں۔" [۷۵]

پروفیسر صدرالدین قریشی کی شاہ پور آمد کے ساتھ ہی لوگوں میں چہ مگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں، کچھ لوگ اس سے خوفزدہ ہوتے ہیں اُسے جادوگر تصور کرتے ہیں تو وہیں کچھ لوگ اس کی ادبی قدر و قیمت سے واقف ہوتے ہیں اور اس کی دانشوری کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

"اوہ، مائی گاڈ تم نے دیکھا وہ آچکا ہے اس کی شخصیت... فادر کیڈلک کی آنکھوں میں چمک تھی انتہائی جاذبِ نظر بلکہ پہلی نظر میں وہ جادوگر لگتا ہے۔" [۷۶]

"اور یقیناً وہ ایک بڑی اور ذمہ دار شخصیت ہے۔ کل میں اس کی وہ تقریر اخبار میں پڑھ رہا تھا جو اس نے سارک کانفرنس میں دی تھی۔ بلا کا دانشور اور ذہین بلکہ جادوگر_ کیوں؟" [۷۷]

پروفیسر ایس کی شخصیت کو ناول میں ڈھالنے کے لئے ذوقی نے کافی محنت کی ہے جس کی بدولت ہمارے سامنے ایک ایسا کردار ابھرتا ہے جو ایک نرم گفتار، بے حد پرکشش شخصیت کا مالک ہے اور اپنی تحریروں سے جادو جگانے والا، لوگوں کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھانے والا، ذہین، لوگوں کا استعمال کرنے والا اور جنسی طور پر بے حد سفاک شخص ہے۔

پرویز سانیال جو کہ ادیتی اور احمد علی کی اکلوتی اولاد تھا جس کے لیے احمد علی نے خود کو تبدیل کر کے دن رات ایک کر کے پیسہ کمایا تا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکے، احمد علی اُسے ایک بڑا انسان بنا ہوا دیکھنا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو مشکلات اُس کے اپنے حصے میں آئیں وہ سب پرویز کو بھی برداشت کرنی پڑیں مگر پرویز ایک ضدی بچہ تھا وہ ہر چھوٹی بڑی بات پر ضد کرتا، پڑھائی میں بھی اس کا دل نہیں لگتا تھا، احمد علی کو روز ادیتی سے اس کی شکایات موصول ہوتیں، احمد علی جس خواب کے پیچھے کلکتہ سے شاہ پور آیا تھا وہ اسے ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ اسی دوران پروفیسر ایس کی خبر شاہ پور میں گونجنے لگی۔

پرویز سانیال کا کردار اس لیے بھی ناول میں اہمیت کا حامل ہے کیونکہ "پروفیسر ایس کے عجیب داستان" کا وہ واحد گواہ ہے اور راوی کا کردار بھی ادا کرتا ہے دراصل احمد علی یا پرویز سانیال اس ناول میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے وہ تو صرف مہرے ہیں پروفیسر ایس کی خانقاہ تک پہنچنے کے، ذوقی نے پرویز سانیال کی زبانی ناول میں جابجا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ احمد علی کی کہانی کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ یہ صرف ضمنی کہانیاں ہیں، پرویز سانیال کی زبانی اس بات کا اعتراف ملاحظہ کریں۔

"سچ پوچھیے تو یہ کہانی نہ میری ہے، نہ احمد علی یعنی میرے والد محترم یا پوجیہ پتا جی کی ـ
یہ کہانی پروفیسر ایس کی ہے۔ اور یقین جانیئے - یہ ایک عجیب داستان ہے اور
جیسا کہ آگے کے ہولناک صفحات میں آپ کو رفتہ رفتہ خود ہی اس بات کی آگاہی
ہوتی جائے گی کہ پروفیسر کی خانقاہ میں کیسے کیسے طلسم تھے۔" [۷۸]

احمد علی بھی اور لوگوں کی طرح پروفیسر کے سحر میں گم ہو گیا اور بغیر سوچے سمجھے اس نے پروفیسر کو گھر پر مدعو کر لیا، ادیتی کے لاکھ منع کرنے پر بھی وہ بعض نہیں آیا اور پروفیسر سے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ پرویز کو اپنی سرپرستی میں لے لے، پروفیسر ایس تو ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے اور بغیر کسی تعامل کے پرویز کے لیے حامی بھر لی مگر وہ اپنی شرائط بتانا نہیں بھولا۔

پروفیسر نے اپنی زندگی میں جس انسان پر بھی انگلی رکھی اسے زندگی بھر کی غلامی قبول کروائی، اس نے پہلی شرط ہی یہی رکھی کہ پرویز پر اس کے والدین کا نہیں بلکہ اس کا حق ہوگا، جذبات میں بہہ کر احمد علی نے حامی بھر لی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ وہ پرویز کے اچھے مستقبل کے چکر میں پرویز کی زندگی برباد کرنے والا ہے وہ نہیں جانتا تھا کہ پروفیسر کی خانقاہ میں جانے کے بعد پرویز کی شخصیت میں کیسی کیسی حیران کن تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ ادیتی کو ان تمام باتوں کے خدشات پہلے دن سے ہی پریشان کر رہے تھے مگر اس کی مخالفت پر بھی احمد علی کے فیصلے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔

ناول کے اس اقتباس سے احمد علی کے خیالات سامنے آجاتے ہیں۔

" کولکتہ سے شاہ پور آتے ہوئے میں بس اسی سپنے کے پیچھے رہا ادیتی کہ میرا بیٹا۔ میرا بیٹا
پرویز کچھ بن جائے۔ وہ میری طرح دھکے پر دھکا نہ کھائے۔ زندگی میں صرف پیسوں
کو ترجیح نہ دے۔ اس کے پاس ترقی کی ایک لمبی اڑان ہو۔ پرواہ نہیں کہ لوگ اس کے
بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ مگر وہ کچھ ایسا کر جائے کہ۔۔۔" [۷۹]

ادیتی کی طرح پرویز کی بچپن کی دوست شبلی بھی پرویز میں رونما ہونے والی نئی تبدیلیوں سے آگاہ تھی، وہ ادیتی سے

اس کا اظہار بھی کر چکی تھی مگر احمد علی خوش تھا کہ پرویز نے اب پڑھائی کی طرف دل اور دماغ دونوں لگانے شروع کر دیئے تھے اس لیے اسے جب بھی کوئی پروفیسر کے بارے میں کوئی بات کرتا تو وہ جھوٹ سمجھ کر رد کر دیتا اور رادیتی کو بھی سمجھاتا کہ وہ بھی لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرا کرے۔

"دوسروں کے بہکاوے میں مت آؤ رادیتی۔ اپنے بیٹے کے رزلٹ دیکھو کلاس میں ہر بار فرسٹ آتا ہے۔ اور یہ معجزہ سوائے پروفیسر کے کوئی بھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔" [۸۰]

پرویز سانیال کے جوانی میں قدم رکھتے ہی محبت اس کی منتظر تھی، وہ محبت جو اس کے بچپن کی دوست شیلی کی صورت میں موجود تھیں جبکہ دوسری طرف پروفیسر کی خانقاہ میں قید سیما کی صورت میں بھی، پر پرویز کو پروفیسر نے اس کے والدین تک کی محبت سے دور کر دیا اسے صرف ایک ہی بات یاد کروائی جا رہی تھی۔

"یہ زندگی محبت کے لئے نہیں ہے موسیو یہ زندگی کچھ کرنے کیلئے ہے اور ہاں یاد رکھیے ابھی آپ کو بہت کچھ کرنا ہے بہت کچھ" [۸۱]

سونامی سے متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنے کے لئے پروفیسر ایس نے پرویز کو بھی ساتھ لے جانا ضروری سمجھا یہی سفر پرویز کی زندگی میں ایک نیا موڑ لایا، موت کو اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد پرویز کے خیالات بھی تبدیل ہوئے، اسی سفر میں وہ پروفیسر ایس کے خیالات سے بھی واقف ہو سکا، پرویز میں آنے والی تبدیلی کو پروفیسر بھی محسوس کر رہا تھا، پرویز کے اندر جو سونامی کی لہریں چل رہی تھیں پروفیسر نہ صرف ان سے واقف تھا بلکہ وہ اس کے نتیجے میں آنے والے انقلاب کا اندازہ بھی لگا رہا تھا یہی بات اسے خوفزدہ بھی کر رہی تھی۔

"میں نے دیکھا پرویز سانیال بہت باریکی سے ایک ایک بات کو نوٹ کر رہا ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں کی چمک میں مجھے کسی آنے والے انقلاب کی دستک سنائی پڑی۔ کیا یہ میرا وہم ہے۔ اوہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کیا پرویز سانیال کے لئے میرے دل میں رشک یا جلن کا جذبہ ابھر رہا ہے۔۔۔ یقیناً نہیں۔ بھلا میں کیوں جلنے لگا۔" [۸۲]

آخر کار پرویز کے اندر جلنے والا طوفان ایک دن باہر آ گیا جس کی امید پروفیسر ایس کو نہیں تھی پرویز سرکاری امداد دینے والے چند ارکان سے الجھ پڑتا ہے کہ وہ فی الوقت امدادی کارروائیوں میں تاخیر کر رہے تھے۔

"مذاق ہو رہا ہے۔ ایک طرف قدرت کا بھیانک مذاق ہے اور دوسری طرف آپ لوگ ہیں جو ان لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ بھیانک مذاق کر رہے ہیں۔ انہیں سچ

کیوں نہیں بتاتے آپ لوگ۔انہیں کیوں نہیں کہتے کہ چار دنوں میں سرکاری کاموں
سے نجات پا کر آپ لوگ اپنے اپنے گھروں میں لوٹ جائیں گے۔ان کے حصے میں
کچھ نہیں آئے گا۔۔۔" [۸۳]

پرویز کی زبان سے ادا ہونے والے یہ الفاظ پروفیسر ایس کیلیئے سونامی کی لہروں سے زیادہ تکلیف دہ تھا اُسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جس پرویز میں وہ اپنا آپ جھانکنے کے لیے گزشتہ دس سالوں سے محنت کرر ہا تھا وہ اصل میں صرف ایک عام انقلابی نوجوان کی صورت میں سامنے آئے گا،اس سفر نے پرویز کوایک نیا روپ دیا تھا،ہمیشہ خاموش رہنے والا نوجوان پرویز سانیال اب پروفیسر سے مکالمے کرنے لگا تھا پروفیسر،پرویز کے اس نئے روپ پر پریشان رہنے لگا تھا کیونکہ وہ پروفیسر کی تمام کمزوریوں سے واقف ہو چکا تھا،پروفیسر اپنی ڈائری میں پرویز سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار بھی کرتا ہے۔

"مجھے احساس ہوا۔پرویز کی جلتی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی ہیں۔جیسے
وہ میرے اندر اتر کر میری کمزوریوں کے تمام راز کا سراغ پا جانا چاہتا ہو۔مجھے یہ بھی
محسوس ہوا کہ یہاں آنے کے بعد پرویز میں ایک عجیب وغریب تبدیلی آئی ہے۔لیکن
آہ،کیا اس کے اندر میرے خلاف بغاوت کی کوئی آندھی چل رہی ہے۔"[۸۴]

پروفیسر کے خدشات جائز تھے کیوں کہ پرویز کے اندر واقعی تبدیلی واقع ہوگئی تھی،اس سفر سے واپسی پر اسے ماں کی محبت تڑپانے لگی تھی،بچپن کی دوست شیلی کا خیال اس کے ذہن سے نہیں نکل پایا تھا اور سب سے زیادہ اسے فکر اس معصوم پرندے سیما کی تھی جو پروفیسر کے رحم وکرم پر صرف پرویز کی آس میں زندہ تھی،اسی دوران احمد علی بھی پرویز کا ساتھ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے کوچ کر گیا جس کے بعد پرویز کے اندر انتقام کی آگ سلگنے لگی،اس کے دل میں صرف ایک ہی بات چل رہی تھی کہ پچھلے دس سالوں میں اس کی زندگی نے جو رنگ بدلے اور اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کا ذمہ دار صرف پروفیسر ایس کی ذات ہے اور اب بدلے کا وقت تھا پروفیسر کو ان سالوں کا حساب دینا تھا،اس وقت کی پرویز کی کیفیت کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"اندر سے بس ایک ہی آواز بار بار دل ودماغ پر دستک دے رہی تھی مجھے اس کا قتل کر
دینا چاہیے۔۔۔آنکھیں میری تھیں مگر ان آنکھوں سے دیکھتا وہ تھا_پاؤں میرے تھے
مگر چلتا وہ تھا احساس میرے تھے،حاوی وہ ہو جاتا تھا پروفیسر دماغ میرا تھا مگر سوچتا تھا
پروفیسر آنکھیں،ہاتھ،پاؤں،جسم،یہاں تک کہ دماغ۔۔۔کسی پر بھی میرا اختیار کہاں
تھا۔" [۸۵]

پرویز سانیال نے پروفیسر ایس کے برسوں سے پڑھائے گئے سبق کو ایک نیا رخ دے دیا تھا وہ پروفیسر کے سارے پینتروں سے واقف ہو گیا تھا اور اب وقت تھا کہ وہ پروفیسر سے اُن دس سالوں کا حساب لے جو اس نے پروفیسر پر لُٹا دیے تھے۔

"وہ جرم اور سزا سے متعلق لمبی لمبی بحثوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس کا مدعا صاف تھا۔
پروفیسر کے سبق میں یہی تو کہا گیا تھا۔
تم ہو___
تم ہو، اس لیے تمہیں حکومت کرنا ہے۔۔۔
بس قصہ ختم وہ ہے اور اس کو حکومت بھی کرنا ہے اور اس لئے راستہ میں کوئی بھی نہیں
آئے گا_ خواہ وہ پروفیسر ہو یا۔۔۔" [٨٦]

ایک طرف پرویز اور سیما نے مل کر پروفیسر کا کام تمام کر کے آزادی حاصل کرنے کا سوچا تو وہیں دوسری طرف پروفیسر نے بھی پرویز کے سامنے اپنا مدعا بیان کر دیا، اس نے پرویز کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ وہ اسے اپنا مہرا بنانا چاہتا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں پروفیسر اپنی بات پرویز کے سامنے دوٹوک الفاظ میں کر دیتا ہے ملاحظہ کریں۔

پروفیسر جھکا۔ آپ کو ذرا بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہے موسیو۔ لوپی چندسیب سے
میری آپ کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ آپ اپنا پی۔ایچ۔ڈی مکمل کریں۔ جس
یونیورسٹی کی طرف انگلی رکھیں گے وہ آپ کی۔ اور موسیو وہاں ایک نہیں، دو نہیں، ہزاروں
نوجوان دماغ ہوں گے، جہاں کمال ہوشیاری سے آپ کو اپنی پیٹھ بنانی ہے۔ آپ کو قبضہ
کرنا ہے اور اپنی فکر کی آبیاری کرنی ہے۔" [٨٧]

مگر پروفیسر ایس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے لیے جال بچھایا جا چکا تھا اور وہ جلد شکار ہونے والا تھا، پرویز سانیال اور سیما نے پروفیسر ایس کیلئے جو جال بنا وہ جاذبِ نظر ہے، اُن کا مقصد صرف پروفیسر کی موت نہیں تھی بلکہ وہ خود پر کیے گئے پروفیسر کے مظالم کا بدلہ لینا چاہتے تھے جس کے لیے وہ پروفیسر کو عام موت نہیں دینا چاہتے تھے، انہوں نے پروفیسر کو اس کے اپنے ہی کمرے میں تڑپا تڑپا کر موت دینے کا منصوبہ بنایا۔

ناول کا یہ حصہ زیادہ جاندار ہے جس میں ایک طرف پروفیسر ایس ادب اکادمی کے جلسے میں جھوٹے آنسوؤں کے ساتھ سونامی متاثرین کی داستان بیان کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کے اپنے کمرے میں اس کی قبر تیار کی جا رہی ہوتی ہے جہاں موت اس کی منتظر ہوتی ہے۔

پرویز اور سیما کا جال بہت مضبوط تھا، پروفیسر کو ان کے منصوبے کی بھنک تک نہیں ہوئی اور وہ بے خبری میں مارا گیا، سونامی لہریں اسے بھی بہا کر لے گئیں، جو بیماری اسے عرصے سے پریشان کر رہی تھی وہی بند کمرہ ہونے کے سبب اس کی موت کا باعث بنی۔

ذوقی جذبات نگاری میں مہارت رکھتے ہیں ان کے ناولوں میں اکثر جگہوں پر جذبات نگاری، منظر نگاری اور مرقع نگاری کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں جو نہ صرف ان کے اسلوب کو چار چاند لگاتے ہیں بلکہ قاری کے لیے بھی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔

"پروفیسر ایس کی عجیب داستان" میں بھی ایسے مناظر نظر آتے ہیں۔

" کہرے کی چادر ہٹ گئی ہے_ یخ چادر سے ایک جسم نکل کر، تیرتا ہوا کھڑکی سے اندر آ گیا ہے آنکھوں پر چشمہ ڈراکیولا کی طرح گول گول، تھرکتی، اندر کو اتر جانے والی پتلیاں یہ پتلیاں ایک منٹ بھی کسی کو دیکھ لیں تو جیسے جسم ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے ہاتھوں میں دستانے، سر پر مفلر، مفلر سے بند کیسے ہوئے دونوں کان_ سیاہ رنگ کی پینٹ۔" [۸۸]

جذبات نگاری کی ایک اور مثال ملاحظہ کیجئے۔

"دیوار کی دائیں طرف ایک بڑی پینٹنگ لگی تھی، جس میں ایک خوفناک بلی کی دو آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں۔ ایک میز تھی، جس پر کتابیں یا کاغذات ایسے بکھرے تھے جیسے ان سے کشتیاں لڑی گئی ہوں۔ بستر کی چادر آج پہلی بار ہزار سلوٹوں کی کہانی دُہرا رہی تھی۔" [۸۹]

ذوقی نے کمال منظر نگاری کے ساتھ ناول کو آگے بڑھایا ہے جس کے مطالعے سے ناول کے پسِ منظر میں چلنے والے کرداروں کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوا جا سکتا ہے۔

"یہ ایک تنگ کوٹھڑی تھی۔ بوسیدہ دیوار کے پلسترجھڑ رہے تھے۔ کمرے میں ساٹھ پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس کے باوجود کمرے میں اتنی کم روشنی تھی کہ مشکل ہی ایک دوسرے کے چہرے سے زیادہ کچھ بھی دیکھ پانا ناممکن تھا۔ ساٹھ پاور کا بلب بھی دھول اور گرد سے سیاہ ہو چکا تھا۔ کمرے میں نہ کوئی روشندان تھا۔ نہ ہی کوئی کھڑکی۔ کنارے ایک کھاٹ لگی تھی۔" [۹۰]

پروفیسر ایس کی خانقاہ کا نقشہ ذوقی نے کمال مہارت سے پیش کیا ہے چند اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"فادر امبر سیو کی عبادت گاہ میں چھت کے حصے میں خوبصورت نقاشیاں کی گئی تھیں۔
اس عظیم الشان ہال میں انگریزوں کے زمانے کے تین فانوس لٹک رہے تھے۔
انہیں اتارنا اور صاف کرنا محال یا مشکل تھا لیکن اتنے برسوں بعد بھی ان کے رنگ
وروغن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔" [۹۱]

"حجرے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تو تھیں، لیکن اب ان کھڑکیوں والے حصے پر بھی
پینٹنگیں بڑی خوبصورتی سے لگادی گئی تھیں۔ آیا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کمرے
میں کوئی کھڑکی بھی ہے۔" [۹۲]

"ڈراؤنے دروازے_ سخت جان دیواریں اونچی اونچی چھتیں پرانے زمانے کے
فانوس_ ایک کے بعد ایک کئی کمرے_ کچھ کمرے اب بھی بند یا اندھیرے میں
ڈوبے تھے۔ باہر کا آہنی دروازہ بند ہو چکا تھا۔" [۹۳]

ذوقی نے کرداروں کی شخصیت کو واضح کرنے کے لیے مرقع نگاری بھی کی ہے۔

"انتہائی خوبصورت سفید چہرہ_ ہلکی گھنی داڑھی آنکھوں پر چڑھا ہوا سیاہ چشمہ
کالے رنگ کا سوٹ سفید شرٹ، خوبصورت نکٹائی کالے رنگ کا جوتا، قد چھ فٹ
سے کچھ ہی کم۔" [۹۴]

ناول کے دوسرے حصے میں ذوقی نے خاص طور پر سونامی کی تباہ کاریوں کو بیان کر کے ناول کی اہمیت بڑھادی ہے، انہوں نے سونامی کی لہروں سے تباہ کن زندگی اور اس سے پھیلنے والی تباہی کے بعد کے مناظر کو ناول میں قلم بند کر کے ہمیشہ کے لئے وہ نقشہ محفوظ کر لیا ہے۔

ناول نگار کی کامیابی ہی اسی بات میں ہے کہ وہ قاری کو تمام مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے ہوئے دکھائے اور قاری اُن مناظر کی دلکشی میں کھو جائے، ذوقی اس فن سے خوب واقف ہیں کہ موضوعات کے مطابق منظر نگاری کی جانی چاہیے اس لیے اس ناول میں ذوقی نے خاص طور پر سونامی کی تباہ کاریوں کے مناظر کو غیر جانبداری سے پیش کیا ہے، انہوں نے اس میں حقیقت نگاری کو ترجیح دی یہی وجہ ہے کہ آج ان کا یہ ناول سونامی کی تباہ کاریوں کے حوالے سے لکھے جانے والے ناولوں میں سر فہرست ہے۔

مکالمہ ناول نگار کے ہاتھ میں اظہار خیال کا بہترین ہتھیار ہوتا ہے جس سے فائدہ اٹھانا کسی کمال سے کم نہیں، مصنف جو کچھ چاہے وہ کرداروں کی زبان سے ادا کرواسکتا ہے، ذوقی جانتے ہیں کہ کن کرداروں کی زبان سے کون سے الفاظ ادا کروانے ہیں وہ اس فن سے بخوبی واقف ہیں، وہ الفاظ کے ساتھ کھیلنے میں بھی مہارت رکھتے

ہیں، وہ اپنے مکالموں کے ذریعہ قاری کو ناول کا اسیر بنا لیتے ہیں ان کے سب ناولوں میں یہی اندازِ تحریر نظر آتا ہے، زیرِ بحث ناول میں بھی وہ اس طرزِ سخن کا بخوبی استعمال کرتے ہیں۔

ذوقی نے خود کلامی کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جس سے خاص طور پر کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ذوقی کو الفاظ کے ساتھ کھیلنے میں مہارت حاصل ہے، انہیں مکالموں کے ذریعے سے قاری کو رجھانے کا ہنر معلوم ہے یہ فن ان کے اکثر ناولوں میں نظر آتا ہے جس کی بدولت وہ قاری تک اپنی بات کی ترسیل مکمل کر لیتے ہیں، انہوں نے اپنا خونِ جگر صرف کر کے سماج کے مختلف پہلوؤں کو تخلیقی جامہ پہنا کر عام انسان تک پہنچایا ہے۔

ناول میں مقامی رنگ بھرنے کیلئے ذوقی نے مقامی زبان بنگلہ کے اکثر مکالموں کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔

"او پولش تھے کے چالا کی کورچھو۔ ہوشیاری۔ پولیس سے ہوشیاری۔" [۹۵]

ایک اور مکالمہ پیشِ نظر ہے۔

"دھارو محمد ارسدیب دامسکرائے اے آمادیر نوتن کامریڈ_ تم نے دیکھا یہ ہے اپنا نیا کامریڈ۔۔۔ چھیلے ناکے پولش دھورے نئے گئے چھیلو (لڑکے کو پولیس لے گئی تھی دادا)_؟" [۹٦]

ذوقی نے قاری کی سہولت کی خاطر ساتھ میں اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے تا کہ جو لوگ ہندوستانی مقامی زبانوں سے واقفیت نہیں رکھتے وہ بھی ناول کا مطالعہ کرتے وقت مقامی مکالموں سے واقف ہو سکیں۔

ناول میں بیانیہ تیکنیک کا استعمال کیا گیا ہے مگر اندازِ تحریر مکالماتی اپنایا گیا ہے اور مکالموں کو برجستگی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے جس کا اظہار راوی خود کرتے ہیں۔

"قارئین_ اور یہی لمحہ مجھے بیش قیمت اور مناسب نظر آیا کہ میں آپ سے دو دو باتیں کر سکوں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مکالمے آپ کو پہلی نظر میں بے ربط معلوم ہوں۔ تسلیم! مجھے بھی احساس ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ... کیوں نہ بطور مصنف میں ان مکالموں میں تھوڑی زندگی پیدا کر دوں۔ اور اس کے لئے، ان مکالموں میں واقعاتی رنگ بھرنا بے حد ضروری ہے۔" [۹۷]

ذوقی نے فلیش بیک کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے اور ساتھ میں ڈائری کی تکنیک کو بھی آزماتے ہیں، پروفیسر ایس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ڈائری جو پرویز سانیال کے ذریعے قاری تک پروفیسر کی لکھی ہوئی زبان میں ہی پہنچتی ہے اسی ڈائری کے ذریعے پرویز سانیال نے پروفیسر کے حالات کو قاری تک پہنچایا ہے جس میں خاص طور پر

پروفیسر کی زندگی میں سونامی کے بعد آنے والی تبدیلیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ پروفیسر نے جب سونامی کی تباہ کاریاں دیکھنے کے لیے مختلف علاقہ جات کا سفر کیا تو اس قیام کے دوران وہ ڈائری لکھنے کی طرف بھی راغب ہوئے، ذوقی نے دن اور تاریخ کے حساب سے پروفیسر کی لکھی ہوئی ڈائری کے چند صفحات کو ناول کا حصہ بنایا ہے، اسی ڈائری میں پروفیسر ایس نے پرویز سانیال میں آنے والی تبدیلیوں پر اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے۔

ذوقی جانتے ہیں کہ بدلتی دنیا کے ساتھ انہیں اپنے ناولوں میں مختلف اسلوب اور تکنیک کے تجربات کرنے چاہیے تبھی انہوں نے اسلوب کو خوبصورت بنانے کے لئے ناول میں صنائع، تمثیلات اور استعارات کا بھی واضح استعمال کیا ہے۔

ذوقی کے ناولوں میں اشعار کا استعمال اکثر دیکھنے کو ملتا ہے جس کی وجہ ان کا شاعری سے لگاؤ ہے مگر وہ صرف نامور شعراء کے اشعار کو ہی ناولوں میں شامل نہیں کرتے بلکہ کہیں کہیں انہوں نے خود بھی شعریت کا سہارا لے کر کرداروں کے جذبات بیان کئے ہیں، زیرِ بحث ناول میں بھی یہ اثر دیکھنے میں ملتا ہے۔

"ایک طرف جنگ ہے۔
اور ایک طرف۔۔۔
جنگ ہمیں آواز دیتی ہے۔
محبت ہمیں کمزور کرتی ہے۔" [۹۸]

ذوقی نے ادیتی سانیال کی زبانی بنگلہ زبان کے گیتوں کا ترجمہ بھی ناول میں شامل کیا ہے ایک مثال ملاحظہ کریں۔

"دیکھو
باہر برسات ہو رہی ہے۔۔۔ کیا تم نے کبھی تنہائی میں سنا ہے؟ محسوس کیا ہے؟
بارش کے گیتوں کو۔۔۔؟۔۔۔" [۹۹]

ناول میں انگریزی الفاظ کا بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے ان کے سبھی ناولوں میں یہ خاص اندازِ تحریر اپنایا گیا ہے، اس ناول میں بھی انہوں نے انگریزی الفاظ کو اسلوب کا حصہ بنایا ہے۔
مثالیں ملاحظہ کریں۔

"یہی ہے تمہارا پیج تھری کلچر (Page three culture)۔" [۱۰۰]

"The complete man. آپ بہت خاص ہیں۔" [۱۰۱]

ناول میں سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس میں مقامی رنگ بھرنے کے لیے ذوقی نے ہندی اور بنگلہ زبانوں کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے ہیں، اس کے علاوہ اسلامی

کا احوال بھی ناول میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

احمد علی کی موت کا احوال پرویز سانیال کی زبانی بیان کیا گیا ہے جس میں تدفین اور رسموں کی ادائیگی بھی نظر آتی ہے۔

"پڑوس کی مسجد کے امام صاحب آ جائیں گے۔ مدرسے کے بچوں کو قرآن پڑھنے
کے لئے بلا لیا ہے۔ کھانے کا پیسہ الگ سے دے دوں گا۔ جس وقت وہ قرآن
شریف ختم کریں گے چائے اور پاپے کا ناشتہ کرا دوں گا۔" [۱۰۲]

مجموعی طور پر اگر اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو باوجود طوالت، اعتراضات اور ڈاکومینٹیشن کے ذوقی کا یہ ناول بہت اہمیت کا حامل ہے، انہوں نے ہمیشہ نئے موضوعات زیر بحث لا کر انہیں جامع انداز میں پیش کیا ہے، ان کے فکر و فن کی گہرائی کی بدولت آج ادب میں ان کو خاص مقام حاصل ہے اور ان کا بے باک اور نڈر انداز ہی انہیں دیگر ادیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول اپنے مختلف اندازِ تحریر اور منفرد اسلوب کی بدولت اپنی مثال آپ اور قابلِ تعریف ہے۔

لے سانس بھی آہستہ

مشرف عالم ذوقی کا کینوس بہت پھیلا ہوا ہے اُن کے موضوعات متنوع ہیں۔

"لے سانس بھی آہستہ" اپنے موضوعات، مسائل، معنوی جہات اور صوری تشکیل کے حوالے سے ایک منفرد فنی کارنامہ ہے اس کے مطالعے سے ذوقی کے امتیاز کے نقوش مزید گہرے اور روشن ہوتے ہیں، انہوں نے ناول میں تجسس اور تحیر کے بے شمار عناصر کو بھر دیا ہے جن کا تعلق صرف واقعات و واردات سے ہی نہیں بلکہ فکر و فن کی تخلیقی قوت سے بھی ہے۔

ذوقی ایک سلجھے ہوئے فکشن نگار ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں نئے اور اچھوتے موضوعات کو زیرِ بحث لا کر مسائل کو اجاگر کیا ہے ان کے ناولوں میں حب الوطنی کا عنصر شدت سے پایا جاتا ہے اس کی وجہ ہندوستان کے حالات ہیں جہاں مسلمانوں کی حب الوطنی پر آئے روز انگلیاں اٹھائی جاتی ہیں، ذوقی نے سیکولرازم پر لکھا اور خاص طور پر مسلمانوں کو تقسیم کے بعد جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا اس پر طبع آزمائی کر چکے ہیں اُن کے ناول "مسلمان" کا موضوع یہی ہے۔

"لے سانس بھی آہستہ" کی کہانی نور محمد اور عبدالرحمان کاردار نامی کرداروں کے گرد گھومتی ہے مگر کہانی کے پسِ منظر میں وہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مصائب اور اذیتوں کا احوال بھی انہی کرداروں کی زبانی بیان کر دیتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں نے جاگیردارانہ نظام میں بادشاہت کی اور تقسیم کے بعد جب جاگیردارانہ نظام کو زوال آیا تو ان کے لیے حالات تنگ ہونے لگے، ایسے میں نئی نسل نے وراثتی جائیدادوں کو فروخت کر کے امیدوں اور آرزوؤں کے نئے محل تعمیر کرنے اور سنہرے سپنے بُننے شروع کر دیے۔

ذوقی نے اس ناول میں گزشتہ ستر سالوں سے درپیش مسائل اور حادثات و واقعات کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ وہ صرف ادب کا ہی نہیں بلکہ برصغیر کی تقسیم کی تاریخ کا بھی ایک حصہ بن جاتے ہیں جس سے آنے والی نئی نسل تقسیم کی تاریخ و سیاست کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو سکتی ہے۔

"لے سانس بھی آہستہ" فکر و فن دونوں اعتبار سے غور و فکر کا متقاضی ہے، اس ناول کی کہانی نئے عہد میں بازاری نظریات کے فروغ کی کہانی ہے جہاں جمہوری قدریں نیست و نابود ہو چکی ہیں، تہذیبوں کو زوال آ چکا ہے، ملک مغربی بازار کے گلیمر میں اندھا دھند بھاگ رہا ہے، لوگ بھول چکے ہیں کہ ہماری تہذیب و تمدن کا مقابلہ مغرب

سے نہیں کیا جاسکتا اور گلوبل ویلیج کے قصے نے ابتذال وزوال کا جو آئینہ دکھایا ہے اس نے فرائیڈ کے اس نظریے کو سچ ثابت کر دکھایا ہے کہ انسانی شعور اس کی فطری جبلتوں کے مقابلے میں کمزور ہے اور اسی بنیادی نقطے پر ناول کی عمارت کھڑی ہے۔

"لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا
خوب... کیا خوب شعر ہے۔۔۔ ہر سانس ایک نئی عبارت خلق کر
رہی ہے۔ ہر سانس ایک نئی دنیا بن رہی ہے۔" [۱۰۳]

اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ذوقی نے خوبصورت بیانیہ اور طلسمی حقیقت نگاری کی آمیزش سے نئی اور پرانی دنیا کا سہارا لے کر تہذیبوں کے تصادم پر سیر حاصل بحث کر کے حقیقت بیان کی ہے، سب سے دلچسپ بات یہ کہ انہوں نے نئی اور پرانی اقدار کے تصادم اور بابری مسجد جیسے سانحہ کے بعد ہونے والی شکست اور قتل و غارت گری کے واقعات کو بھی ناول کا حصہ بنا کر ان حالات کی بھی عکس بندی کر دی ہے، انہوں نے بابری مسجد کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے اور تہذیبوں کی شکست و ریخت کا گھناؤنا منظر پیش کرنے کے باوجود بھی وہ نا امید نہیں نظر آتے، انہوں نے کبھی بھی اپنی تخلیقی آزادی کو کسی کے کہنے پر نہیں چھوڑا اس ناول میں بھی وہ تخلیقی آزادی کا سہارا لے کر عالمی بازار کو بے نقاب کرتے ہیں۔

ذوقی کے موضوعات ہمیشہ انوکھے ہوتے ہیں وہ اسی موضوع پر لکھتے ہیں جسے اور قلم کار نظر انداز کر رہے ہوتے ہیں یا ایسے حساس موضوعات جن پہ اکثر فکشن نگار تنقید کے ڈر سے نہیں لکھتے۔

ذوقی نے اس ناول کو Family Incest کے موضوع پر لکھا ہے اور جنسی رشتوں کے ایسے گھناؤنے اور بھیانک واقعات پیش کئے ہیں کہ قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن سے قبل شاید ہی کسی فکشن نگار نے اس موضوع پر ایسی دلیری اور جرات کا مظاہرہ کیا ہو۔

باپ بیٹی کے درمیان جسمانی تعلق کو جس بے باکی اور جرات کے ساتھ ذوقی نے بیان کیا ہے اس پر وہ تعریف کے اہل ہیں، ذوقی کے بارے میں اکثر ناول نگاروں کی رائے یہی ہے کہ وہ ایک سلجھے ہوئے فکشن نگار ہیں، ترقی پسند خیالات و نظریات کے حامل ادیب ہیں ان کی تحریروں میں بھی اس کی جھلکیاں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔

باپ بیٹی کے مقدس رشتے کی پامالی کے متعدد واقعات تاریخ کا حصہ رہے ہیں اور ادب کا بھی جز بنے ہیں مگر ذوقی نے اس ناول کے کرداروں کی نوعیت کو اس مرتبے تک پہنچا دیا ہے جہاں فن ایک شاہکار کی شکل اختیار کر لیتا ہے، یہ ناول

صرف تاریخ اور تخیل کی ہمکاری سے ہی اس حیثیت تک پہنچا ہے۔

ذوقی نے نئی تہذیب و اخلاق کو نئے معنوی تناظر میں دیکھا ہے اور قاری کو بھی وہی دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ذوقی نے جنسیات کو مرکزیت عطا کر کے عصرِ حاضر کے آفاق گیر مسئلے کو موضوعِ بحث بنایا ہے ہمارے معاشرے میں باپ بیٹی، ماں بیٹے، بھائی بہن، کسی مرد کا اپنی بیوی اور بیٹی دونوں کے ساتھ جنسی تعلق رکھنا نہ تو کوئی برداشت کرتا ہے اور نہ ہی ایسے موضوعات پر لکھنا پسند کرتا ہے مگر ذوقی نے یہ جرات کر کے اردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے انہوں نے کمال مہارت سے اس موضوع کو اپنایا ہے۔

چونکہ ہمارے سماجی اور مذہبی اعتقادات ایسے گھناؤنے اور قابلِ نفرت فعل کی نا تو اجازت دیتے ہیں اور نہ ہی برداشت کرتے ہیں مگر اس حقیقت سے پردہ ہٹانے کی ضرورت تھی کیونکہ اس سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، ذوقی نے اس ناول کی کہانی جس کردار کے گرد بنی ہے وہ بھی ایسے ہی خوفناک گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

ذوقی نے اس تاریخی سچائی کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ تہذیب رنگ بدلتی ہیں اور ان رنگوں سے ارتقاء کا رنگ پھوٹتا ہے ایسے ہی رنگوں کی وضاحت ناول کے دو کرداروں عبدالرحمٰن کاردار اور پروفیسر نیلے کے ذریعے سے کی ہے جہاں وہ بدلتی ہوئی تہذیب کے احساس سے آگاہ تو ہیں مگر وہ اس کی خوفنا کی سے وہشت زدہ بھی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر منظر اعجاز اس ناول کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

> "مشرف عالم ذوقی نے یہ کہانیاں گھڑی نہیں ہیں بلکہ اپنی فنکارانہ ہنرمندی سے کٹنگ (cutting)، پیسٹنگ اور ڈبنگ کا کام کیا ہے۔ تہذیب، ترقی اور روشن خیالی کے دعوے کو آئینہ دکھایا ہے۔ مواد صحافتی، مصالحہ اخباری ہے لیکن اسے ادب کے قالب میں ڈھالنا فنکاری ہے۔۔۔ یہاں رشتوں کے مقدس دھاگے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔" [۱۰۴]

یہ ناول ایک عام قاری کے لیے شاید دلچسپی کا باعث نہ بنے مگر یہ ناول سنجیدہ اور ماڈرن جنریشن کو ضرور پسند آیا ہوگا۔

نند کشور وکرم اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "ناول نویس کے مطابق ہماری تہذیب و تمدن کو گلوبلائزیشن اور مغربی تہذیب کے حملے نے بُری طرح متاثر کیا ہے۔ موجودہ تہذیب نے ہر شے کو بکاؤ بنا کر رکھ دیا ہے۔ رشتوں کے بندھن کی ڈور انتہائی کمزور پڑ گئی ہے اور رشتوں کی شناخت کا انسانی دائرہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے اور سمٹ کر میاں بیوی اور بچوں تک محدود ہو گیا ہے۔۔۔" [۱۰۵]

ذوقی کا یہ ناول اردو ناول کی تاریخ میں ایک منفرد تجربہ ہے، ان کے غیر معمولی اندازِ بیان، ڈرامائی مکالمے، تاریخی واقعات کی موثر بیانی، منفرد موضوع اور مشاہدے کی گہرائی و گیرائی نے اس ناول کو اہم ناولوں میں شمار کر دیا ہے، ذوقی نے اپنے فکری سروکار اور فنی طریقہ کار سے اس ناول کو مذاہب، فلسفے اور حکمتوں کی ناکامیوں کا نوحہ بنا کر تاریخ رقم کر دی ہے۔

ذوقی کا اس طرز کا یہ پہلا ناول ہے جس کے مطالعے سے قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، جتنا بھی مضبوط انسان ہو وہ اس ناول کے مطالعے کے دوران اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا۔

انسان کا المیہ ہی یہی ہے کہ وہ تلخ حقائق سے دور رہنا چاہتا ہے ذوقی نے اس ناول کی کہانی کے ذریعے قاری کو سنسنی خیز دنیا میں بھی پہنچا دیا ہے۔ ڈاکٹر منظر اعجاز اس ناول کی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "اردو میں بھی بہت سارے افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں سنسنی خیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے مگر "لے سانس بھی آہستہ "اپنی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے ممتاز، منفرد اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس سنسنی خیزی میں برف زار کی طوفانی ہوا کا وہ جھونکا ہے جس سے رگِ شل اور روح منجمد سی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔" [۱۰۶]

ذوقی کا یہ ناول بنیادی طور پر جدیدیت کی فکری روایت اور فلسفیانہ احساس سے ہمکنار ہونے کی وجہ سے حزن وملال سے پُر اور یاس انگیز ہے۔

ذوقی صحافت سے وابستہ ہونے کے ناطے دنیا کے معاشی اور سیاسی حالات سے باخبر رہتے ہیں، اسی پہ بس نہیں بلکہ وہ اپنے ناولوں میں ان موضوعات پر بات چیت بھی کرتے رہتے ہیں، زیرِ بحث ناول میں بھی ایک طرف وہ امریکہ، ابوظہبی اور دبئی جیسے بڑے مراکز کے ہل جانے کا قصہ بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف سوائن فلو اور سارس جیسی بیماریوں سے لڑتے لوگوں کا نوحہ بھی بیان کرتے ہیں، ملاحظہ کریں ایک مختصر اقتباس جس سے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

> "روزانہ ۱۵۰۰ سے زیادہ عورتیں بچہ پیدا کرنے کے دوران مر جاتی ہیں۔ شوگر، کینسر، ہائی بلڈ پریشر، ایڈز، ہارٹ اٹیک ۹_/۱۱ سے گجرات اور ۲۶/۱۱ تک ایک خوفزدہ کرنے والی دنیا ہمارا استقبال کرتی ہے۔" [۱۰۷]

ذوقی نے تقسیم کے بعد فیوڈل نظام کی طرف پیش قدمی کو بھی ناول میں بیان کیا ہے، تقسیم کے بعد کی صورتحال کو ذوقی نے ایک کردار عبدالرحمٰن کا ردار کی کہانی سے جوڑ کر پیش کیا ہے جہاں گاندھی اور قائداعظم کی حمایت ومخالفت

میں مکالمے سننے کو ملتے ہیں، کوئی گاندھی کو دوش دیتا ہے تو کوئی قائداعظم کو۔

ذوقی کے ناولوں میں وطن سے محبت کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے اس حوالے سے خاص طور پر تقسیم کے بعد لوگوں کا پاکستان کی طرف ہجرت کا سن کے سخت ردعمل ہوتا اپنی مٹی سے جڑے ہوئے لوگ الگ ہونے کا تصور نہ کر سکتے اور جو ہجرت کر کے پاکستان آئے انہیں بھی نئی زمین راس نہ آئی، اپنوں سے دوری کا احساس انسان کو جینے ہی نہیں دیتا ایسی ہی صورتحال ناول میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے، زمین سے محبت کی مثال اس مکالمے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

"تم ہمیں پاٹھ مت پڑھاؤ۔ سب پتہ ہے۔ تم تو ٹھہرے مسلم لیگی۔۔۔ جانے دو۔
بھائی ہم تو نہیں جائیں گے۔ یہیں پُشتوں کی ہڈیاں دفن ہیں۔ اب ایک دو گز زمین
اپنی بھی۔ اب اس بڑھاپے میں پاکستان جا کر کیا کریں گے۔" [۱۰۸]

تقسیم کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کو بھی زوال آ گیا، جس کے اثرات جاگیردارانہ سوچ رکھنے والے افراد پر بھی پڑے، اس موضوع پر بھی ذوقی نے لکھا ہے اس حوالے سے ایک کردار کی زبان سے اس نظام کے زوال کی وضاحت کرتے ہیں اقتباس ملاحظہ کریں۔

"سب چھوٹے بڑے ہو جائیں گے۔ جو کل تک ہمارے سامنے کھڑے ہونے کی ہمت
نہیں کرتے تھے، دیکھو آج کیسے سینہ تان کر چل رہے ہیں۔ یہی آزادی کی سوغات ہے۔
جس نے بڑے چھوٹے کے فرق کو ہی ختم کر دیا ہے۔ اس آہٹ کو سنو وسیع، ورنہ یہ برا وقت
تمہیں نگل جائے گا۔" [۱۰۹]

ہندوستان کی تقسیم تو ہو گئی، پاکستان بن تو گیا پر اس سے دونوں ملکوں کے باسیوں کو جو تکالیف و مشکلات برداشت کرنی پڑیں اس پر ذوقی کی گہری ہے ایک اقتباس کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے ملاحظہ کریں۔

"ملک بالآخر تقسیم ہو گیا۔ لیکن کاردار، دیکھو تو کوئی کہیں بھی خوش نہیں ہے۔ ہندوستان آج
بھی تقسیم کے نتائج بھگت رہا ہے۔ ادھر پاکستان اپنے ہی لوگوں کی جنگ کی سزا پا رہا ہے۔
اور ان سے الگ قدرت ہے۔ جو تماشہ دیکھ رہی ہے۔ قدرت ہمیشہ سے تماشہ دیکھ رہی
ہے۔ پھر ایک دن ان تہذیبوں کو نگلنے کے لیے تباہی بھیج دیتی ہے۔" [۱۱۰]

ذوقی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے ناولوں میں تاریخی شواہد دیکھنے کو ملتے ہیں اس ناول میں بھی دو تین جگہوں پر وہ تاریخ کے صفحات پلٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"سوچتا ہوں وہ پہلا انگریز کون تھا جو ہندوستان آیا۔ یقیناً وہ اپنے مذہب کی تبلیغ میں آیا

ہوگا۔تاریخ کی کتابوں میں اس پہلے انگریز کو تھامس اسٹیفن کے نام سے جانا جاتا ہے۔۔۔
جن میں سوار ہوکر دوسو کی تعداد میں نوجوان فرنگیوں نے ہمارے ملک کو خوش آمدید کیا۔کم
بخت لٹیرے۔" [۱۱۱]

ذوقی نے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ہندوستان میں آشرم کی آڑ میں جو جنسی کاروبار کیا جارہا ہے اس کا بھی پردہ فاش کیا ہے، آئے روز اس طرح کے واقعات ہندوستانی خبروں کی زینت بنتے رہتے ہیں مگر ہندو معاشرے میں اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات کسی میں بھی نہیں نظر آتی ایسے میں ذوقی نے اس موضوع پر بات کر کے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا ہے، اس حوالے سے دو کرداروں کے درمیان ہونے والے گفتگو جاذب نظر ہے ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کریں۔

" کتنے ہی آشرم ہیں جہاں سیکس ریکٹ چلائے جارہے ہیں۔ہندوستان اس مہذب
ہوتی صدی میں ساری دنیا کے لیے سیکس کا بڑا بازار بنتا جارہا ہے۔اور وہاں۔غیر ملکی
کھلے پن سے گھبرا کر اب انہی آشرموں میں پناہ لے رہے ہیں۔" [۱۱۲]

یہاں پر داد طلب بات یہ ہے کہ ذوقی کبھی کسی مذہب پر کیچڑ نہیں اچھالتے انہوں نے صرف حقائق کو بیان کرنا چاہا ہے اور یہ الفاظ انہوں نے ان ہندو کردار کی زبان سے ادا کروائے ہیں کیونکہ اگر وہ کسی مسلمان کردار کا سہارا لیتے تو اس سے قاری کو جانبداری کا شبہ ہوتا مگر ذوقی نے ہندو کردار کو چُن کر حقیقت کو مزید واضح کر دیا ہے۔

اس ناول کا مرکزی موضوع جس پر ذوقی نے قلم اٹھایا پہلے بتایا جاچکا کہ باپ اور بیٹی کے جسمانی تعلق کی سفا کی کے گرد گھومتا ہے۔اس حوالے سے ذوقی نے کھلے ڈلے الفاظ میں متعدد رپورٹس اور واقعات بیان کئے ہیں، اس کے علاوہ دو کرداروں کے ذریعے اس پورے نیٹ ورک کو ناول میں بیان کرتے ہیں اس حوالے سے ۴۳۱ صفحہ سے لے کے ۴۴۲ صفحات تک کا مطالعہ اس نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے کیا جاسکتا ہے۔

یہ ایک بہت گھناؤنی اور تلخ حقیقت ہے مگر اس سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں گوگل پر Family incest کلک کرتے ہی اس گھناؤنی دنیا کے ہزاروں خانے روشن ہوجاتے ہیں جہاں سے رشتوں کی خوفناک فلمیں منظر عام پر آتی ہیں، جہاں مقدس رشتوں کی پامالی دکھائی جارہی ہوتی ہے، اُن مقدس رشتوں کی ماپالی نظر آتی ہے جن سے تہذیب کی سلامتی کی باگ دوڑ بندھی ہوتی ہے یہ سب حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ اگر سچ نہ ہوتا تو یہ فلمیں نہ بنائی جا رہی ہوتیں۔

اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں ذوقی نے حقیقت نگاری کا کھلا ثبوت بیان کیا ہے۔

"یہاں میں لکھتا ہوں India, incest family یا پاکستان کا نام لکھوا اور یہ

دیکھو وہ دکھا رہے ہیں یہاں کوئی یوروپین نہیں ہے امریکہ، برطانیہ یا آسٹریلیا کے
جوڑے نہیں ہیں تمہارے لوگ ہیں کاردار پاکستان کے، ہندوستان کے_ اپنے سگے
جو جنسی اشتعال انگیزی میں گم ہیں۔" [۱۱۳]

آج کے دور کے رشتوں کی مقدس دنیا میں بھی سیکس کے جراثیم گھل گئے ہیں جس پر ذوقی نے کمال مہارت سے اس ناول کو ترتیب دیا ہے، اس حقیقت کو بیان کرنے میں وہ کس طرح کی بھی ہچکچاہٹ نہیں برتتے بلکہ کھلے ڈلے الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

"ادھر دیکھو Google کی سکرین پر اپنی نظریں مرکوز کرو_ دیکھو جہاں میں نے
لکھ دیا Family incest اور اب دیکھو_ کلک کرتے ہیں۔۔۔باپ بیٹی میں
سیکس_ ماں بیٹے میں سیکس_ خاندان کے ساتھ گروپ سیکس۔۔۔ بھائی بہن میں
سیکس... سوتیلی ماں کیساتھ ... ماں بیٹی کے ساتھ باپ کا دونوں کو Seduce
کرنا۔" [۱۱۴]

ان صفحات میں ذوقی ایک کے بعد ایک وار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں بچوں کے جسموں کے ساتھ ہونے والے کھیل کو بھی وہ بے نقاب کرتے ہیں اس حوالے سے بھی ان کا لکھا ہوا اقتباس ملاحظہ کریں۔

"سیکس کے سوداگروں نے معصوم بچوں کی عصمت بھی لوٹ لی۔چھوٹے چھوٹے معصوم
بچے۔۔۔ لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں Child Sex کی سیڑھیاں ہندوستان
سے عالمی بازار تک پھیلی ہوئی ہیں۔خریدار ہیں تب تو سیڑھیاں فروخت ہو رہی ہیں۔" [۱۱۵]

مشرف عالم ذوقی نے انسان کے سماجی کرب، ظلم اور استحصال کو ہمیشہ موضوعِ گفتگو بنایا ہے، انسان کتنا مہذب نظر آتا ہے مگر درحقیقت اس کے اندر کتنا بڑا شیطان چھپا ہوتا ہے انہوں نے اس ناول کے ذریعے اس حقیقت کا پردہ فاش کر دیا ہے۔

ذوقی نے نور محمد کی کہانی کے ذریعے بے رحمی کی مثال قائم کر دی ہے جو صرف بیٹی کو زندہ رکھنے کی خاطر عذاب میں مبتلا ہوتا ہے نور محمد کی نوعیت و کیفیت سارے زمانے سے مختلف ہے، آج کا انسانی معاشرہ ایسے متعدد عذابوں میں مبتلا ہے، جس کی ایک کڑی نور محمد کی کہانی بھی ہے۔

ذوقی کے فنی شعور کی پختگی اور فنکاری کا اظہار غیر روایتی انداز میں ہوا ہے انہوں نے تہذیب و اخلاقیات کو نئے معنی و تناظر میں دکھانے کے لیے جنسیات کو مرکزیت عطا کر دی ہے اور اسے عصرِ حاضر کے آفاق گیر مسئلے کے طور پر پیش کیا ہے لیکن وہ جنسیت میں عریانیت کا سہارا نہیں لیتے ،جنسی مسائل کو خواہ وہ انفرادی ہوں یا کہ اجتماعی

تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کرتے کیونکہ اس سلسلے میں وہ تخلیقی رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں، انہوں نے جنسیات پر دنیا میں ہونے والے واقعات، پورن سائٹس میں حقیقت پر مبنی موجود مواد کے بارے میں مفصل لکھا ہے جس کے مطالعہ کے بعد باپ بیٹی کے درمیان جنسی تعلق اور خاص طور پر ناول کے پسِ منظر میں چلنے والے کہانی کی سنسنی خیزی اپنی شدت تاثر مکمل طور پر کھو نہیں دیتی تو قدرے کم ضرور کر دیتی ہے۔

ذوقی نے اس ناول کے ذریعے نئی تہذیب کا گھناؤنا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے جہاں محرم رشتوں کے ساتھ جنسی تعلق معمول بنتا جا رہا ہے، ناول کے اختتام پر ذوقی نئی تہذیب کی طرف راغب کرنے کے لیے ناول کے ایک کردار کی زبان سے مکالمات ادا کرواتے ہیں کہ ماضی یاد رکھنے کے لیے نہیں ہوتا، نئی تہذیب میں پرانی تہذیب کو گھولنا کسی حماقت سے کم نہیں، جنگوں کے بعد اکثر ایک نئی تہذیب کی شروعات ہوتی ہے مگر کونسی جنگ کے بعد یہ خوفناک تہذیب ہمارے حصے میں آئی ہے؟ یہ سوالیہ نشان ذوقی قاری کے ذہن میں چھوڑ جاتے ہیں۔

"تو انڈا ٹوٹ چکا ہے۔ پرانی دنیا کے خاتمے سے ایک نئی تہذیب اپنا سر نکالنے والی ہے۔ مرغی کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح۔" [۱۱۶]

اس ناول کو سمجھنے کی ضرورت ہے ذوقی نے اس میں حرام کو ایک طرح سے حلال کر دکھایا ہے کیونکہ ایک پاگل انسان پر کوئی شریعت نہیں نافذ ہوتی، وہ ہر جھنجھٹ سے آزاد ہوتا ہے، نہ نکاح کا حقدار اور نہ ہی جائیداد و وراثت کا۔ اس ناول میں ہونے والے تمام اتفاقات کا ذمہ دار ناول کا کوئی کردار نہیں بلکہ قدرت ہے فطرت کے ارتقاء سے ہی یہ رشتے جنم لیتے ہیں ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ہمارے نام نہاد، صاف ستھرے معاشرے کا پردہ چاک کیا ہے، ایک سوال اور بھی گردش کرتا ہے کہ اگر ہمارے معاشرے میں رشتوں کی حرمت برقرار ہے تو نیٹ پر پورن سائٹس پر مقامی ویڈیوز کیوں وجود ہیں؟ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ہاں بھی شر کا یہ پہلو نہ صرف موجود ہے بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے ذوقی نے تمام پہلوں پر بے باکی سے بات کی ہے جو ناول کو مزید دلچسپ بنا دیتا ہے، کولونیل حالات میں لذت کی مارکیٹ نے نہ صرف ناول کو بلکہ اس موضوع کو بھی جہت دی ہے۔

ذوقی کے ناولوں میں اکثر مغربی ناولوں کے اقتباس دیکھنے کو ملتے ہیں جو ان کی مغربی ناولوں پر گہری تنقیدی نظر کی واضح مثال ہے اس حوالے سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

" کانوں میں بہت عرصہ پہلے پڑھی ہوئی ہرمن ہیسے کے ناول ڈیمیان کے لفظ حرکت کرتے ہیں۔ 'سنو سنکلیر ... شاید تمہیں ایک بار پھر میری ضرورت پڑے_ اگر تم نے

مجھے بلایا تو میں یوں گھوڑے کی طرح سرپٹ تمہارے لئے بھاگا چلا آؤں
گا۔۔۔" [۱۱۷]

ایک جگہ پر ذوقی نکولائی گوگول کی کتاب Dead Souls کا حوالہ بھی دیتے ہیں جو ان کے وسیع مطالعہ کا منہ بولتا ثبوت ہے، اس کے علاوہ البیئر کاموکے ناول کا تذکرہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

"میری آنکھوں میں البیئر کاموکے مشہور زمانہ ناول وپلیگ کا کردار ڈاکٹر ریواتر
رہا تھا جو ہیضہ کے پھیلنے کے بعد ایک نومولود بچی کو بچانے میں ناکام ہوکر خدا
سے پوچھتا ہے اس کا گناہ کیا ہے؟" [۱۱۸]

ذوقی نے ناول میں مغربی صورتحال کو بھی ساتھ ساتھ ناول کا حصہ بنایا ہے اور عصرِ حاضر کی تہذیب کا اس سے تقابلی جائزہ بھی لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

درحقیقت یہ ناول انسان کا المیہ ہے کہ اس نے اس نئی تہذیب سے کیا حاصل کیا اور کیا کھویا مگر یہ حقیقت اتنی تلخ ہے کہ قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

ذوقی نے ناول کے اکثر صفحات پر فلسفیانہ تصورات اور فکر سے متعلق جملوں کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے جس سے ذوقی کی تحریرانہ پختگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ذوقی نے اس ناول کے لیے اُتر پردیش کے "بلندشہر" کی فضا کا انتخاب کیا ہے جس میں تہذیبوں کی پامالی کی کہانی دیکھی جاسکتی ہے، اس ناول کو سماجی پیرائے میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جہاں قدرت انسانوں کے ساتھ مختلف کھیل کھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس ناول کے پسِ منظر میں مختلف فکریں گردش کرتی ہیں ملک کا تقسیم ہونا، رسموں کی پامالی، رشتوں کی بدلتی ہوئی حالتیں، تہذیبوں کا خوفناک تصادم، جاگیردارانہ نظام کی پامالی اور خاص طور پر اس گھٹن کے ماحول میں سانس لینے والی خاموش محبت کی داستان اس کے موضوعات ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد اپنی کتاب میں اس ناول کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

"لے سانس بھی آہستہ تہذیبوں کے عروج وزوال کی کہانی ہے جہاں اخلاقیات کی فرسودہ بحث کو
ذوقی ایک بڑے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس کا سہارا لے کر ایک عظیم شاہکار
لکھ جاتے ہیں یہاں وقت ہیرو ہے۔ قدرت ہمیں ذبح کررہی ہے اور انسان فاتح ہے جو مصیبتوں
میں بھی اریسنٹ ہمنگوے کے بوڑھے آدمی کی طرح شکست تسلیم نہیں کرتا اور فتح کو ہی اپنا
مقصد جانتا ہے۔" [۱۱۹]

ذوقی نے اس ناول کے ذریعے قاری کو احساس دلایا ہے کہ وقت بدل رہا ہے، پرانی روایتیں، قدریں اور تہذیبوں کی اہمیت اب پہلے جیسی نہیں رہی وقت سب بہا کے لے گیا اور نئی تہذیب پاؤں پھیلائے پورے سماج کو اپنے اندر جذب کرنے کے درپے ہے اور وہ اس بات سے بھی آگاہی رکھتے ہیں کہ نئی نسل اسی بدلتی ہوئی تہذیب کو پسند کرتی ہے۔

ذوقی کے اندازِ بیان کے بارے میں مختلف لوگوں نے یہی رائے دی ہے کہ موضوع اور فکر کے اعتبار سے ان کا یہ ناول ایک غیر معمولی اور بولڈ ناول ہے جس کے مقابلے کا اور کوئی ناول منظرِ عام پر نہیں آیا۔

توہم پرستی ہمیشہ سے ہی انسان کے ساتھ چلتی رہی ہے چاہے وہ گزرا ہوا زمانہ ہو یا آج کا جدید دور اس حوالے سے اکثر لوگوں کی زبانی کچھ نہ کچھ ضرور سننے میں ملتا رہتا ہے ذوقی نے زیرِ بحث ناول "لے سانس بھی آہستہ" میں اپنے باقی ناولوں کی طرح کرداروں کی توہم پرستی کو بیان کیا ہے اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> "اماں روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ارے اس کلموہے کو کیڑے پڑیں۔ یہاں تو اپنی بس ایک اولاد ہے وہ عمل کرنے بیٹھا ہے۔ بیوی پر جنات کا سایہ ہے۔ وہ اس کا توڑ کرے گا۔ اس لیے اس نے ایک ہی سفید کاغذ کی مانگ کی۔" [۱۲۰]

ذوقی نے تقسیم کے بعد کی صورتحال کو ناول کا حصہ بنایا تو اُس وقت کے لوگوں کے خیالات میں توہم پرستی جیسی فرسودات پائی جاتی تھیں اس لیے ذوقی نے ناول میں حقیقی رنگ بھرنے کے لیے کرداروں کے مزاج کے مطابق اس کو بھی اسلوب کا حصہ بنایا اور اسے عورتوں کی زبانی اس لیے بیان کیا کیونکہ آج بھی گھریلو عورتوں کی زبانی ایسے خیالات سننے میں آتے رہتے ہیں کیونکہ وہ توہمات پر اندھا یقین رکھتی ہیں۔

"لے سانس بھی آہستہ" اردو ناول کی تاریخ میں ایک منفرد تجربہ مانا جا سکتا ہے، ذوقی نے اس ناول میں غیر معمولی اور منفرد موضوع کا انتخاب کیا ہے۔

ذوقی نے ناول کا انتساب ڈاکٹر محمد حسن کے نام کیا ہے لکھتے ہیں کہ

> " اس صفحہ پر بس ان کا حق ہے... "

اور ساتھ میں میر تقی میر کا مندرجہ ذیل شعر بھی درج کیا جس سے ناول کا سرنامہ ماخوذ ہے۔

> "لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
> آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا"

انتساب کے مطالعے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ فکری یا فنی سطح پر کہیں نہ کہیں ڈاکٹر محمد محسن کی شخصیت اس ناول

کی تخلیق میں اصل محرک بنی ہے اس حوالے سے مشرف عالم ذوقی سے ذاتی استفسار پر وہ کہتے ہیں کہ ان کے لیے یہ ناول بہت اہم ہے، ڈاکٹر محمد حسن کی عظمت کے وہ شروع سے قائل تھے مزید کہتے ہیں کہ وہ چوبیس سالہ نوجوان تھے جب ڈاکٹر محمد محسن نے کہا کہ اس وقت کا سب سے بڑا افسانہ نگار مشرف عالم ذوقی ہے، اسی عقیدت کی وجہ سے انہوں نے اس ناول کا انتساب ڈاکٹر محمد حسن کے نام کیا ہے۔

تمہید کے طور پر ہرمن ھیسے کے ڈیمیان سے ماخوذ اقتباس پیش کرتے ہیں جس کا آخری جملہ خاص طور پر کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

"ارتقاء کے راستے میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔" [۱۲۱]

اس کے بعد انسانی مقتدرات کی ستم ظریفی کی کہانی جس میں تہذیبِ انسانی کے ارتقاء کی راہیں اخلاقیات کی دھجیوں سے اٹھی ہوئی ہیں ان کی وضاحت وہ مندرجہ ذیل تین جملوں کے ذریعے سے کرتے ہیں۔

" کبھی کبھی قدرت کے آگے/
ہم بیحد کمزور ہو جاتے ہیں/
اور سپر ڈال دیتے ہیں ہیں"

ذوقی نے ناول کے چار حصوں میں تقسیم کر کے ابواب کو مندرجہ ذیل نام دیے اور آخری حصے کو "اور آخر میں دعا" کا عنوان دیا ہے۔

پہلا حصہ:

کاردار خاندان کے آثار

حصہ دوم:

تہذیبوں کا تصادم

حصہ سوم:

نیا انسان

حصہ چہارم:

جبلّت

جن مرکزی کرداروں کے گرد مشرف عالم نے یہ کہانی بُنی ہے ان کا شجرہ نسب ابتداء میں ہی انہوں نے ناول کا حصہ بنا دیا ہے تا کہ قاری کو آگے کرداروں کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

۲۰۰۸ء میں یہ ناول منظر عام پر آیا اور آتے ہی صفِ اول کے ناولوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ کسی بھی تخلیق کے کامیابی اسی میں ہوتی ہے کہ اس پر نقادوں نے کتنا لکھا ہے اس حوالے سے نہ صرف ذوقی کو آڑے ہاتھوں لیا گیا بلکہ ناول کا موضوع بھی زیرِ بحث رہا، خوش آئند یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے ان کے منفرد موضوع، اندازِ تحریر اور بے باکی کی تعریف کی ہے جن میں یونس خان، ڈاکٹر محمد حسن، سیمیں کرن، شمع خالد اور منصور خوشتر جیسے متعدد نام شامل ہیں۔

جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا کہ اس ناول کا پلاٹ دو خاندانوں کا ردار خاندان اور نور محمد کے خاندان سے بُنا گیا ہے۔ بظاہر تو قصہ نور محمد کے خاندان سے متعلق ہے مگر کہانی کا راوی عبدالرحمٰن کا ردار ہے جو نور محمد کا واحد قریبی دوست ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی نادرہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے، نور محمد کی اس کہانی سے اس کی کہانی بھی جڑی ہے اس لئے دونوں کو مرکزی کردار کہا جائے گا۔ کہانی کا پلاٹ عمدہ ہے جس میں حیرت وحسرت کی جھلکیاں نمایاں نظر آتی ہیں۔

ذوقی نے کمال مہارت سے تمام لڑیوں کو پرو کر ایک خوبصورت ناول ترتیب دیا ہے، کہیں بھی قاری بوریت کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی کہیں سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، ابتدائی صفحات میں قاری کی دلچسپی بڑھانے کے لیے آگے پیش کی جانے والی کہانی کی تمہید مندرجہ ذیل الفاظ میں باندھتے ہیں۔

> "انتظار کیجئے۔ اس بے حد بے رحم وقت میں، میں آپ کو ایک ایسی بے رحم کہانی یا کردار سے
> ملانے لے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے جسے سننے کے لیے آپ کے کان آشنا نہ ہوں۔ یا جسے
> محسوس کرنے کے لئے آپ کے دل کی حرکتیں رک جائیں۔ یا جسے آنکھوں کے پردے
> پر دیکھنے کی عجلت آپ کی آنکھوں کی بینائی چھین لے۔" [۱۲۲]

ذوقی نے بے رحم حقیقتوں کے الجھاؤ کو اپنی فنکاری اور فنکارانہ ہنر مندی کے ساتھ ناول کے بنیادی قصے میں پیوند کر دیا ہے اور ان کی ہمکاری سے اصل قصے کو موثر بنا دیا ہے اس قدر موثر کہ ایسی بے رحم اور سفاک حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔

ذوقی نے ناول کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جن کو موضوع کی مناسبت سے عنوان بھی دیے گئے ہیں جیسے غلامی میں سے فیڈرل سسٹم کی طرف، پروفیسر نیلے بندر اور آزادی، جادوگری اور چوں چوں کا مربا وغیرہ۔ یہ ناول فکر وفن دونوں لحاظ سے غور وفکر کا متقاضی ہے، ناول کے اختتام پر یہ قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس کی کہانی نئے عہد میں بازاری نظریات کے فروغ کی کہانی ہے جہاں پر جمہوری قدریں نیست ونابود ہو چکی ہیں

اورزوال مقدر ہے، زیرِ بحث ناول کا کینوس اتنا بڑا ہے کہ اس میں تقسیم کے بعد کی صورتحال بھی موجود ہے اور عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو بھی موضوع گفتگو بنایا گیا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ ذوقی نے تقسیم کے بعد کے زمانے کے حالات کے ساتھ آج کے حالات کا موازنہ کیا ہے، انہوں نے یہ کہانی نور محمد کے کردار کے گرد بنی ہے، نور محمد جو محبت کا متلاشی ہوتا ہے بچپن میں ہی ماں کا بیمار رہنا اور پھر ماں کی ناگہانی موت اس پر بہت اثر انداز ہوتی ہے اس کا بچپن ممتا کے پیار سے محروم رہتا ہے کچھ ہوش سنبھالتے ہی باپ کا سایہ بھی سر سے اٹھ جاتا ہے ایسے میں نور محمد کے کردار کی مضبوطی دیکھنے میں آتی ہے وہ زندگی کو روکتا نہیں بلکہ خوشحال زندگی کے خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کے پیچھے ایک ہی چہرہ ہوتا ہے نادرہ کا، سب محبتیں وہ اسی میں تلاش کرتا ہے۔

عبدالرحمٰن کا ردار کو وہ بڑا بھائی اور واحد دوست سمجھتا ہے جس سے وہ ہر چھوٹی بڑی بات پر اظہارِ خیال کرتا ہے نادرہ اور اس کی کہانی ایک سی ہوتی ہے، دونوں ہی بچپن میں ماں کے کھو جانے کے غم سے نڈھال ہوتے ہیں اور ایک دوسرے میں اپنا درد ڈھونڈ لیتے ہیں آخر کار نور محمد کو نادرہ کا ساتھ مل جاتا ہے اسے لگتا ہے وہ ساری خوشیاں جس کے لیے وہ بچپن سے ترستا رہا اسے مل گئی ہیں مگر وہ خوشیاں بھی عارضی ثابت ہوئیں اور نادرہ ایک کم سن بچی نگار کو جنم دے کر اس دنیا فانی سے کوچ کر گئی۔

نگار پیدا ہوتی ہے تو اپنے ساتھ رونے کی بیماری لاتی ہے اس پر رونے کے ایسے دورے پڑتے کہ اس کا دم گھٹنے لگتا بڑھتی عمر کے ساتھ وہ کسی طور پر ذمہ دار بچوں میں شامل نہیں کی جا سکتی تھی اسے نہ کپڑوں کا خیال رہتا نہ اپنے جسم کا۔

نور محمد نگار کو نادرہ کی نشانی سمجھ کر پالتا ہے اور اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتا، نادرہ کے بعد وہ سب لوگوں سے کٹ کر رہ جاتا ہے صرف نگار کی وجہ سے، کیونکہ اجنبیوں کو دیکھتے ہی اس پر رونے کا دورہ پڑ جاتا۔

> "نادرہ کی یادگار میرے لئے اب یہی میری زندگی ہے. میں ساری ساری رات اللہ کے حضور میں نگار کی زندگی کے لئے دعا مانگتا ہوں۔۔۔میں جانتا ہوں اس کی موجودگی کسی بیمار پرزے کی طرح ہے مگر آخر ہے تو انسان گوشت پوشت کے انسان میری نادرہ کی نشانی۔اب اس بیمار کل پرزے کو پھینک تو نہیں سکتا بھیا۔" [۱۲۳]

نور محمد، نادرہ کی موت کے بعد دس سال تک اُسی کوٹھی میں نادرہ کی نشانی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے اس عرصے میں بہت سے واقعات گزرتے ہیں، ذوقی نے نور محمد کی نفسیاتی الجھنوں کا اسلوبِ بیان اور طرزِ عمل پر بحثیت ناول نگار جو توجہ دلاتی ہے وہ فنی شعور کی پختگی اور فن کاری کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نادرہ کی موت کے بعد اخلاقیات کا تقاضا یہی تھا کہ نورمحمد دوسری شادی کر لیتا کیونکہ بڑھتی عمر کے ساتھ نگار میں تبدیلیاں آ رہی تھیں ایسے میں ایک عورت ہی اسے سنبھال سکتی ہے مگر نادرہ کی محبت میں نورمحمد نے اس سے انکار کر دیا اور نگار کو خود سمبھالنے لگا جس کی وجہ سے اس رشتے کا ایک بہت بھیانک روپ سامنے آیا جس کی شروعات تب ہوئی جب نورمحمد کا کوئی رشتہ دار لڑکا کچھ دنوں کے لیے اس کے گھر قیام کرتا ہے اسی دوران نگار پر دورہ پڑتا ہے اور اسی کے ساتھ اس میں جنسی تبدیلیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں جسے نورمحمد ایک بے بس باپ کے روپ میں خود اپنی زبانی بیان کرتا ہے۔

> "وہ رو رہا تھا۔ اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ وقت اور حالات مجھ سے جو کہانی لکھوا رہے ہیں، میں اس کے لئے قطعی تیار نہیں تھا بھیا۔۔۔ یہ نگار تھی جو میرے پاؤں کے پاس جھکی ہوئی تھی اور میرے ننگے جسم کو غور سے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اس کے اندر سیکس کے مطالبے جاگ گئے ہیں۔" [۱۲۴]

ذوقی نے اس ساری سچویشن کو فنکارانہ مہارت سے پیش کیا ہے نگار کی زندگی بچانے کی خاطر نورمحمد اُس کی ضرورت پوری کر دیتا ہے جس سے وہ حاملہ ہو جاتی ہے بدنامی کے خوف سے نورمحمد نگار کو لے کر کسی گاؤں چلا جاتا ہے جہاں وہ مذہب کو گلے لگا لیتا ہے مگر نگار کے ساتھ کو بھی بھیانک الفاظ میں بیان کرتا ہے جو کسی باپ کے لئے موت سے کم درجہ نہیں رکھتا۔

> "اکثر رات گئے نگار کی طلب بڑھ جاتی۔ میں غصے میں دھکا دیتا تو وہ پاگلوں کی طرح مجھ سے جھپٹ پڑتی۔ میں روتا۔ ہاتھ جوڑتا۔ تو وہ جنون کی حالت میں کپڑے پھینک کر مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کرتی، جسے احساسِ گناہ اور احساسِ جرم کے ساتھ میں نے صرف اس کی زندگی کے لئے قبول کر لیا تھا۔" [۱۲۵]

نورمحمد کے کردار میں بے بسی کوٹ کوٹ کے بھری ہے، قاری کی اس کے ساتھ ہمدردی پورے ناول میں ساتھ ساتھ رہتی ہے، نورمحمد اس سارے بیان کے دوران اپنی مجبوری اور کسمپرسی پر روتا بھی ہے اور اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ

> "ہر رشتے کی اپنی اہمیت ہے۔ مگر یہاں رات گئے جیسے سانپ کے پھنکارنے کی آواز ہوتی تھی اور نگار کی خطرناک طلب۔۔۔" [۱۲۶]

نورمحمد کا کردار پوری تلخی، کٹھورتا اور بے باک سچائی کے ساتھ زندگی کی زہرناکی کو برداشت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ سب کچھ کھو کر بھی زندہ رہتا ہے، نگار اپنے باپ کے نطفے سے ایک بٹی جینی کو جنم دے کر اس جہان فانی سے

کوچ کر جاتی ہے مگر نور محمد کے لیے ایک اور آزمائش جینی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو اس کی بیٹی کی اولاد تھی مگر قدرت کی ستم ظریفی کہ وہ اس کی بھی اولاد تھی۔

"بے رحم حقیقت۔لیکن اسے تسلیم کرنا ہی ہے بھائی۔میری بیٹی۔لیکن قدرت کا ظلم کہ اس کی ماں بھی میری بیٹی تھی۔وہ رو رہا تھا۔قدرت کا انتقام۔اور یہی تو جاننا ہے مجھے کہ اس انتقام کے لئے خدا نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا۔" [۱۲۷]

نور محمد کو زندگی کا زہر پینا پڑتا ہے۔ناول کی یاس انگیز فضا اور گھٹن بھرے ماحول میں نور محمد کا کردار زندگی کی زہرنا کیوں کو برداشت کرتا ہوا آخر کار بے تکلفی سے اس زہر کو پینے لگتا ہے خاص طور پر ناول کی آخری صفحات میں یہ تبدیلی نظر آتی ہے جسے اس کا دوست اور کہانی کا راوی عبدالرحمٰن کا ردار بخوبی پہچان لیتا ہے،نور محمد سے اظہار خیال کے حوالے سے ذوقی نے عبدالرحمٰن کا ردار کی زبان سے ایسا جاندار جملہ ادا کروایا ہے ملاحظہ کریں۔

"مذہب کے احترام کے باوجود نور محمد ایک ایسے راستے پر چلا جہاں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی مجبوری تھی۔مگر جیسے برسوں سے،صدیوں سے قدرت اس بیمار نظام کو دیکھ رہی تھی۔اس لیے ہر بار قدرت انتقام کے طور پر ایک تہذیبی دنیا کو تباہ کر ڈالتی ہے اور پھر ایک نئی تہذیب کی شروعات ہو جاتی ہے۔" [۱۲۸]

نور محمد کو حالات و واقعات اس مقام پر لا کھڑا کرتے ہیں جہاں وہ بے بس اور لاچار نظر آتا ہے لیکن اس کے کردار میں ایک حیرت انگیز مضبوط اعصاب کا جفاکش، وفا شعار مرد نظر آتا ہے جو زندگی کی گھٹن اور مشکلات کا سامنا کرتا ہے، سنگین سے سنگین حالات میں بھی زندگی سے منہ نہیں موڑتا۔

ذوقی نے نور محمد کے کردار کے ذریعے زندگی کے ایسے پہلوؤں کو موضوع گفتگو بنایا ہے جو ایک عام مسلمان کے لیے نا قابل یقین عمل ہے۔

عبدالرحمٰن کا ردار جو کہ کہانی کا راوی ہونے کے ساتھ ساتھ مرکزی کردار کہلانے کا بھی مستحق ہے،اس کردار کے ذریعے ذوقی نے تقسیم کے بعد کی ملکی صورتحال کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ہندوستان کی تقسیم کے بعد وہاں کے لوگوں کے لیے اس تقسیم کو ماننے میں بڑا وقت لگا، رشتے تقسیم ہو گئے، بھائی جدا ہو گئے مگر دونوں ملکوں کے باسیوں کے دل میں اپنے اپنے وطن کی محبت قائم رہی۔

عبدالرحمٰن کا ردار جو کہ مٹتی ہوئی تہذیب کا وارث، جاگیردارانہ تہذیب کی مٹتی ہوئی روایت کا پاسدار ہوتا ہے، یہ کردار ایک نا قابل فراموش کردار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کیونکہ یہ کہانی کے آغاز سے اختتام تک ناول میں چھایا

رہتا ہے ذوقی نے اس کردار کے ذریعے تقسیم کے بعد کی صورتحال کو مفصل بیان کیا ہے اس قصے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ نور محمد کی چاہت نادرہ ہوتی ہے اور نادرہ کی چاہت عبدالرحمٰن کا ردار، اس سچ سے عبدالرحمٰن کا ردار غافل رہتا ہے۔

اس کردار میں مضبوطی کم دیکھنے کو ملتی ہے وہ محبت تو کرتا ہے مگر اس محبت کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتا بلکہ اپنے والدین کے سامنے چپ کا سہارا لیتا ہے، ماں کی خواہش پر بیوی بیاہ کر لے آتا ہے مگر نادرہ کو کسی اور کا ہوتے دیکھ کر دلی گھٹن کا شکار رہتا ہے، نور محمد کی خوشی پر وہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے، یہ کردار اس وجہ سے بھی نا قابل فراموش کردار ہے کیونکہ نادرہ کی نفسیاتی اور جنسی گھٹن کی وجہ بھی عبدالرحمٰن کردار ہوتا ہے اور یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ نگار کی پیدائشی ذہنی بیماری کا اصل سبب بھی عبدالرحمٰن کا ردار اور نادرہ کا تعلق ہوسکتا ہے۔ عبدالرحمٰن کا ردار بڑھاپے میں ایک پہاڑی سلسلے کا انتخاب کر کے بقیہ زندگی پرانی یادوں، مایوسی، محرومی اور تنہائی کا زمانہ بلند شہر سے دور گزارتا ہے جہاں اس کو ایک ہمسفر ملتا ہے جس سے وہ اپنی گزشتہ زندگی کے احوال کے علاوہ نئی تہذیب پر سیر حاصل بحث بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ناول کے مطالعے کے دوران اس کردار کی نفسیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے وہ نور محمد سے کرید کرید کر سب کچھ اگلوا لینا چاہتا ہے کہیں کہیں نور محمد کی معصومیت کو دیکھتے ہوئے قاری کو یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن کا ردار نور محمد کے جذبات سے کھیلتا ہوا نظر آتا ہے، نور محمد کا خط ملنے پر عبدالرحمٰن اس سے ملنے جاتا ہے جہاں وہ نور محمد کے ہر حرف، ہر لفظ، ہر جملے اور ہر عبارت پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے جس سے نور محمد اور جینی کے طرز عمل اور گفتار کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہوتا ہے، اس ملاقات سے جہاں نور محمد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر کے پھر سے زندگی میں واپس آجاتا ہے وہیں عبدالرحمٰن کا ردار کو بھی احساس ہوتا ہے کہ اس نے نادرہ سے کیا ہوا وعدہ جس پر پہلے عمل نہ کیا تھا اب وہ پورا ہو گیا۔

ناول کے اختتام پر عبدالرحمٰن کا ردار کا نور محمد سے کہا ہوا یہ جملہ کہ "_ بڑھے _ ابھی مجھ سے زیادہ زندہ رہو گئے تم _" معنی خیر تاثر کو مزید گہرا کر دیتا ہے اور آخر میں مولانا روم کا مصرع اس معنی خیز تاثر کو آفاقیت کے رنگ و آہنگ میں ڈھال دیتا ہے۔

"ہر نفس نو می شود دنیا و ما...

ہر آن ایک نئی دنیا تعمیر ہو رہی ہے" [۱۲۹]

ناول میں ایک اور کردار پروفیسر نیلے کا ہے جو کا ردار کی طرح اپنے آبائی علاقے سے دور بیوی کے ساتھ ان پہاڑوں

کو اپنا مسکن بناتا ہے، ان کی اولاد بھی ان سے دور ہے۔

عبدالرحمٰن کا ردار کے پڑوسی اور تنہائی کے ساتھی ہونے کے ناطے وہ دونوں اکثر پہاڑی سلسلوں پر ایک ساتھ گھومتے، پھرتے اور حالاتِ سابقہ وحاضرہ پر تبصرے کرتے رہتے ہیں اور اپنے حال احوال بھی ایک دوسرے کے ساتھ بانٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر نیلے کے کردار کی مضبوطی عبدالرحمٰن کا ردار کی نسبت زیادہ ہے، دونوں ہی تہذیبوں کے بدلتے رنگوں سے واقفیت رکھتے ہیں مگر عبدالرحمٰن کا ردار کی نسبت پروفیسر نیلے اس نئی تہذیب کے بدلتے رنگوں سے وحشت زدہ نہیں ہے وہ ہر طرح کے تجربات کرتا ہے، انٹرنیٹ کی دنیا میں Family Incest کے موضوع پر وہ کا ردار کو حقائق دکھاتا ہے تاکہ وہ اس کہانی کے بھنور سے نکل آئے جس کو لے کر وہ ہمیشہ ناگہانی خوف میں مبتلا رہتا تھا۔ اس تجربے کے بعد کا ردار میں ایک واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے جیسے وہ نور محمد اور نگار کے تعلق کے خوف سے نکل آیا ہو، اس کے بعد ہی وہ یہ فیصلہ کر پاتا ہے کہ محمد کے بلانے پر جانا چاہیے۔

پروفیسر نیلے کی زبان سے ہی ذوقی نے تلخ حقائق کو بیان کیا ہے جہاں وہ اس سو کالڈ تہذیب کے ورق پلٹتے ہوئے تجربات کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

> "پروفیسر نیلے نے گہری سانس بھری۔ میں نے اس تجربے کو جاری نہیں رکھا۔ ویسے بھی اس عمر میں، میں ان چیزوں کا خواہشمند نہیں۔ تجربہ۔ صرف ایک تجربہ۔ لیکن اس تجربے نے مجھے بہت سکھایا کا ردار۔" [۱۳۰]

یہاں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ پروفیسر نیلے اور عبدالرحمٰن کا ردار ان پہاڑوں کے ویرانے میں زندگی کی رمق گھولنے پر کیوں مجبور تھے، ان کی زندگی موت کی سرحدوں کو چھو رہی تھی ان کی اولاد اور اولادوں کی اولاد بھی اپنے اپنے مسائلِ زندگی میں الجھی ہوئی تھی ایسے میں اس اولڈ ایج میں ان کی حویلیوں میں کوئی بھی ان کا پرسان حال نہیں، وہ ایسے اقداری نظام سے بھی تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں اس عمر کے لوگ اللہ اللہ اور رام نام کی جاپ میں باقی ماندہ عمر گزار دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو پروفیسر نیلے کا کردار ضمنی کردار ہونے کے باوجود بھی ناول میں اپنی الگ شناخت بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ناول کی ضخامت سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ناول میں بہت سے کردار گردش کرتے ہیں، نسوانی کرداروں میں بھی بہت سے ضمنی اور مرکزی کردار نظر آتے ہیں جن میں نادرہ کا کردار، نگار، عبدالرحمٰن کا ردار کی والدہ، جینی اور

رقیہ کے علاوہ اور بھی کچھ نسوانی کردار نظر آتے ہیں مگر ان میں جاندار صرف نادرہ کا کردار ہے۔

نادرہ جو والدین کے ساتھ پاکستان میں رہتی تھی مگر ماں کی بے وقت موت کے بعد وہ پاکستان سے واپس ہندوستان آ جاتے ہیں عبدالرحمٰن کا ردار (جو کہ اس کا پھوپھی زاد بھائی ہوتا ہے) کے گھر قیام کے دوران اس سے نور محمد کی ملاقات ہوتی ہے، ناول کے پسِ منظر میں ابھرنے والی المنا کی یہ بھی ہے کہ نور محمد کی والدہ اور نادرہ کی والدہ کی بے وقت موت نے دونوں کے معصوم ذہنوں پر اثر ڈالا اور اس مشترکہ غم نے ان دونوں کو قریب کر دیا جس کی وجہ سے عبدالرحمٰن کا ردار غلط فہمی کا شکار ہو گیا، نادرہ اس سرد مہری کو برداشت کر لیتی ہے اور روایتی اخلاقیات کے تقاضے پورے کرتے ہوئے چپ سادھ لیتی ہے مگر اپنی موت کو قریب دیکھ کر وہ عبدالرحمٰن کا ردار سے نہ صرف شکایت کرتی ہے بلکہ برہنہ گفتار بھی ہو جاتی ہے۔

"کیوں نہیں ہو میرے ــــ کمی کیا تھی مجھ میں مانگ کیوں نہیں سکے مجھے ابو تو لٹے لٹائے جان کی خیرات مانگنے پہنچے تھے تمہارے گھر مانگا ہوتا تو آسانی سے مل جاتی میں میں ہمیشہ سوچتی تھی، تم اب مانگو گے مجھے... اب مانگو گے... مگر تم نے تو... ایسا کیوں کیا رحمٰن...

بولو... کیوں کیا ایسا۔" [۱۳۱]

نادرہ اپنے دل کا حال سنا دیتی ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زخمِ محبت اور دردِ جدائی سے اس کا سینہ چھلنی تھا، نگار کی ذہنی بیماری کے پیچھے بھی یہی درد چھپا ہوتا ہے نادرہ عبدالرحمٰن سے اظہارِ خیال ان الفاظ میں کرتی ہے۔

"مجھے کیوں نہیں مانگا؟ دیکھو میری بیٹی کو... زندہ لاش لگتی ہے نا... ممکن ہے تمہاری ہو جاتی تو زندگی میں یہ وقت ہی نہیں آتا۔۔۔" [۱۳۲]

اس غم سے دونوں نڈھال ہوتے ہیں مگر بالآخر نادرہ دم توڑ دیتی ہے جس کے بعد عبدالرحمٰن کا ردار بھی احساسِ جرم کے سہارے زندگی گزارنے لگتا ہے۔

کردار نگاری کے لحاظ سے اس ناول کا ہر کردار اپنے اندر ایک معنویت رکھتا ہے۔

ناول نگار چونکہ کہانی کے کرداروں کی زندگی مکمل طور پر پیش کرتا ہے اس لیے اسے کرداروں کے مزاج و مراتب کے اظہار کے لئے مکالموں سے کام لینا پڑتا ہے اس حوالے سے مشرف عالم کے تمام ناولوں میں مکالمہ نگاری کہیں کم اور کہیں زیادہ نظر آتی ہے۔

ذوقی مقامی بولیوں سے واقفیت رکھنے کے ناطے ناولوں میں بھی وہی زبان استعمال کرتے آئے ہیں وہ چار دیواری میں بند عورتوں کے محاوروں، ضرب المثال، نچلے طبقے کا اندازِ گفتگو اور خاص طور پر تقسیم کے وقت کے ہندوستان کی

زبان کی ہو بہو عکاسی کرنے کے علاوہ عصرِ حاضر کے کرداروں کے لیے آج کل کی زبان استعمال کرتے ہیں تاکہ قارئین کو مکالموں کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

زیرِ بحث ناول میں بھی جابجا مکالمہ نگاری نظر آتی ہے اس حوالے سے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

" کتنی ٹھنڈ ہے دڈّو...

ہاں...

کھڑکی کیوں کھولی۔۔۔

کوئی تو بات ضرور ہے دڈّو

اچھا کیا بات ہو سکتی ہے؟" [۱۳۳]

ذوقی کی مکالمہ نگاری کی بہت تعریف سننے کو ملتی ہے آج کل وہ اپنی کہانیوں کو محفل ہو یا مجلسوں میں پڑھتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ سامعین ان کے زوردار مکالموں، مسحورکن آواز اور اندازِ ادائیگی کے جادو میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ محفل بھر میں سناٹا چھا جاتا ہے، اُن کے مکالموں کی ادائیگی میں جابجا ایسے مواقع دیکھنے کو ملتے ہیں جب وہ قاری کو اپنے بیانیہ انداز کے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

کہیں کہیں طوالت بھی نظر آتی ہے جس سے قاری اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے، زیرِ بحث ناول میں بھی طویل مکالمات دیکھنے کو ملتے ہیں اگر مشرف عالم ان کو مختصر بیان کر دیتے تو زیادہ جاذبِ نظر ہوتے، انہوں نے طویل انگریزی مکالمات کو بھی ناول میں شامل کیا ہے چونکہ اردو ادب کی اکثریت انگریزی سمجھنے سے قاصر ہے تو یہ مکالمات قاری کو کھٹکتے ہیں اگر ذوقی ان مکالمات کے ساتھ اردو میں ترجمہ کر دیتے تو اس کی روانی بھی قائم رہتی اور قاری کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوتی، اپنی طرف سے تو ذوقی نے کرداروں کی مانگ کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے جو ایک ایسے قاری کے لیے تو تحریر کی خوبی ثابت ہوتی ہے جو تمام زبانوں اور خاص طور پر انگریزی زبان سے واقف ہو مگر ایک ایسا قاری جو انگریزی زبان پر مہارت نہیں رکھتا اس کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

خود کلامی بھی دیکھنے کو ملتی ہے جو کہ عبدالرحمٰن کا کردار (ناول کے راوی) کے ذریعے ذوقی نے ناول کا حصہ بنائی۔ اس حوالے سے اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"افسوس تم ڈر رہے ہو کاردار تم پوچھو تو سہی جینی ہے کون ممکن ہے تم جو بھی سوچ رہے ہو، تمہارا وہم ہو۔۔۔ تم اس سے ڈر رہے ہو کاردار تم اس سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو یہاں تک کہ نگاہیں ملانے سے بھی گھبرا رہے ہو_ اگر ایسا ہے تو اس سے پوچھ کیوں نہیں لیتے اس کی

اصلیت۔" [۱۳۴]

خود سے استفہامیہ جملے بھی نظر آتے ہیں جس کے ذریعے ذوقی نے کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کو عیاں کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کریں۔

"سب جانتے ہو کاردار کیونکہ زندگی کی سچائیاں تلخ ہیں یہ سچائیاں اچانک ہمیں بیمار بنا دیتی ہیں۔۔۔آئینہ میں جھملاتے عکس نے سوال کا رخ موڑ دیا ہے_ نور محمد سے ملنے جاؤ گے؟" [۱۳۵]

ناول میں منتخب کرداروں کی ہو بہو تصویر کشی کرنا مرقع نگاری کہلاتی ہے جس میں کرداروں کے حلیے کے ساتھ ان کی شخصیت بھی عیاں ہو جاتی ہے۔

ذوقی نے کرداروں کے حلیے اس طرح سے پیش کیے ہیں کہ ظاہری شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کا باطن بھی پینٹ ہو جاتا ہے۔

اس حوالے سے اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"ابا نے خود کو مذہب کے دائرے میں باندھ لیا تھا۔آنکھوں پر چشمہ، قد لگ بھگ چھ فٹ۔داڑھی بڑھی ہوئی۔گھنگھریالے بال جن میں سفیدی جھانے لگی تھی۔" [۱۳۶]

"سلام بھائی دور کے رشتے دار تھے۔ایک دم کالے۔قد چھ فٹ سے نکلتا۔کہیں سے بھی ہمارے گھر کے نہیں لگتے تھے۔دبلے پتلے تھے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کوئی بھی لباس ان کے جسم کے ساتھ میچ نہیں کرتا تھا۔" [۱۳۷]

"یہ بچو چاہوتے۔لنگی اور کرتا پہنتے۔گوشت کی بحث کو۔۔۔ان کے مسکرانے اور بولنے کا لہجہ عجیب تھا۔آدھی بات وہ مسکرانے میں گول کر جاتے۔لیکن اس مسکراہٹ میں طنز کی آمیزش ہوتی۔وہ ہر بات کو کاٹنا ضروری سمجھتے تھے۔" [۱۳۸]

"خشخشی داڑھی۔آنکھوں میں سُرما، سفید کُرتا پائجامہ اور کندھے پر تہہ کی ہوئی گندمی رنگ کی شال لپیٹے۔" [۱۳۹]

ذوقی نے منظر نگاری پر خاص توجہ دی ہے خاص طور پر قدرتی مناظر کا ذکر بہت خوبصورتی سے کیا گیا ہے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے ہزاروں پتے، پتھریلی زمین پر بچھے ہوئے تھے۔۔۔ مظاہرِ قدرت نے اپنا خزانہ لٹایا تھا۔۔۔ نیچے گھنیری وادیاں۔خودرو جھاڑیاں۔

خودرو پھول۔ شاخوں سے الجھی ہوئی شاخیں۔ پرندوں کے بولنے، چہچہانے
کی آوازیں۔" [۱۴۰]

میت کے گھر کی منظر نگاری بھی اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے جس میں ذوقی نے اسلامی طریقہ کار کو واضح کیا ہے اقتباس ملاحظہ کریں۔

" کمرے میں اگربتی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چوکی، چادر اور باقی سامان ہٹا دیئے
گئے تھے۔ لوبان جل رہا تھا۔ باہر کچھ عورتیں قرآن شریف کی زور زور سے تلاوت
کر رہی تھی۔ لاش زمین پر رکھ دی گئی تھی۔ چہرا جسم ڈھک دیا گیا تھا۔۔۔" [۱۴۱]

" لے سانس بھی آہستہ " کا اسلوب جاذبیت اور دلکشی کا منہ بولتا ثبوت ہے جس میں برمحل اور خوبصورت لفظوں کا استعمال کر کے مشرف عالم ذوقی نے نہ صرف اسلوب کو منفرد بنایا ہے بلکہ دلچسپ بھی بنایا ہے، انہوں نے تاریخی صداقت اور کہیں کہیں صحافیانہ اندازِ تحریر کو اپنایا ہے جس سے ناول کا اسلوب مختلف نظر آتا ہے۔

زیرِ بحث ناول میں فلیش بیک کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے جبکہ اندازِ تحریر بیانیہ اپنایا گیا ہے۔

ذوقی نے کرداروں کی زبانی اشعار کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے ایک جگہ پر ابنِ انشاء کا شعر بیان کرتے ہیں۔

"فرض کرو یہ جی کی بپتا جی سے جوڑ سنائی ہو
فرض کرو ابھی اور ہو اتنی آدھی ہم نے چھپائی ہو" [۱۴۲]

میر تقی میر کا شعر جس سے ناول کا نام ماخوذ ہے اس کو بھی ایک کردار کی زبان سے بیان کرتے ہیں ملاحظہ کریں۔

"لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا"

ڈوبتی ہوئی تہذیب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"وہ بے حد ڈراؤنا پرندہ تھا
لیکن مجھے یقین تھا
اس تہذیب سے
ایسے ہی ڈراؤنے پرندے جنم لیں گے" [۱۴۳]

ذوقی نے انگریزی حروف کا بھی جابجا استعمال کیا ہے مگر اس میں ان سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ کرداروں کے مطابق وہ زبان استعمال کرنے میں ناکام ہوئے ہیں، بچوں کی زبان سے انگریزی کلمات ادا کرواتے ہیں اس کے علاوہ ایک نیم ملا کے کردار سے بھی انگریزی حروف کا استعمال کرواتے ہیں جو اسلوب کی ایک بڑی

غلطی ہے۔

ناول میں مقامی لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانے کے لیے اکثر مکالمے مبالغے سے بھرپور نظر آتے ہیں۔

"ہم لوگ تو بس معمولی وسیلہ ہیں۔اب جیسے کوئی انجینئر ہے، ڈاکٹر ہے، ویسے
ہم بھی اپنے کام میں ماہر ہیں۔جیسے کوئی وید یا حکیم بغیر نبض دیکھے بھی مرض کی
تشخیص کر لیتا ہے۔ٹھیک ویسے ہی ... ہماری آنکھیں بھی گمشدہ خزانوں کے
راز جان لیتی ہیں۔" [۱۴۴]

ذوقی نے کرداروں کی زبانی اسلامی تاریخ پر بھی کہیں نہ کہیں نظر رکھی ہے جس کی وجہ سے اکثر اسلامی حوالے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ایک ہندو کردار کی زبانی اسلام پر مبنی ایک مکالمہ ملاحظہ کریں۔

"جیسے حضرت موسیٰ اور سامری جادوگر کا ذکر۔خود اللّٰہ کے نبی پر جادو کیا گیا تھا۔
یہودیوں نے کتنی ہی بار اللّٰہ کے نبی پر جادو کرنے کی کوشش کی۔پھر آپ کے
یہاں سلیمان بھی تھے۔جنات، ہوا، چرند اور پرند پر حکومت کرتے تھے۔" [۱۴۵]

ذوقی نے قرآنی آیات کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ان کی اسلام پر گہری نظر ہونے کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے جنس کی
عورتیں بنائیں۔تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور میاں بیوی میں محبت
بڑھے۔" [۱۴۶]

ذوقی نے اقوال کا استعمال بھی کیا ہے جس سے ان کے اندازِ بیاں اور اسلوب میں رونق پیدا ہوئی ہے۔

"مجھے کوئی پرانا قول یاد آتا ہے... سارے انسان برابر ہیں۔اللّٰہ نے سب کو
ایک جیسے حقوق دیئے۔ایک جیسی زندگی۔ایک جیسی خوشی، اور ایک جیسی
زندگی۔۔۔" [۱۴۷]

"مولانا روم کی بانسری کی آواز میرے کانوں میں آہستہ آہستہ گونج رہی تھی۔
ہر نفس نو می شود دنیا وما" [۱۴۸]

ذوقی نے ناول میں فنکارانہ اسلوب استعمال کیا ہے جہاں شکوک وشبہات کا سہارا لیا گیا ہے جس میں درحقیقت ایک مجبور اور ایک بے بس باپ کی مجبوری کو شبہات کے پردے میں چھپا کے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قیاسات اور خواہشات پر مبنی ایسے بیانات قدرے طویل تو نظر آتے ہیں مگر یہ بھی کسی حقیقت سے کم نہیں کی ایک

قیاسات کو بروئے کار لاکر اشارے کنائے میں بیان کر دینا چاہتا ہے، یہ ذوقی کی فنکارانہ مہارت ہے کہ انہوں نے اس پیچیدہ موضوع پر خوبصورت اسلوب کا سہارا لے کر قاری کی پہنچ تک نہ صرف آسان بنایا ہے بلکہ اس اندازِ بیان پر داد بھی پائی ہے، انہوں نے تاریخی صداقت اور کہیں صحافیانہ واقعیت کا استعمال کیا جو اسلوب میں شفافیت اور قطعیت بھی پیدا کر دیتی ہے۔

ناول میں تجس کو بھی اسلوب کا حصہ بنایا ہے جو قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، ذوقی زیادہ تر داستانوی اندازِ اسلوب کا استعمال کرتے ہیں جو ان کو دیگر فکشن نگاروں سے ممتاز کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ خوبصورت بیانیہ اور طلسمی حقیقت نگاری کی آمیزش سے اس ناول کی فضا کو بُنا گیا ہے اور جیسا کہ مثالوں کے ذریعے واضح کر دیا گیا ہے کہ ذوقی نے محاورت، دلکش تشبیہات، استعارات، ضائع لفظی اور مختلف اصطلاحات کا استعمال کیا ہے جس سے ناول میں مزید نکھار آیا ہے۔

ذوقی کا اسلوب اور اندازِ بیان جدید اسلوب کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے، انہوں نے منفرد اسلوب کا استعمال کیا اور اندازِ بیان، ڈرامائی مکالمے، تاریخی واقعات کی موثر بیانی اور خاص طور پر مشاہدے کی گہرائی و گیرائی اس ناول کو عصرِ حاضر کے نمائندہ ناولوں میں شامل کر دیتی ہے، ادب کا باذوق قاری اس ناول کے مطالعے سے لطف حاصل کر سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱ ۔ https://m.facebook.com/story.php?stary_fbid=102212125
11923286&id=1260581814

۲ ۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا،صریر پبلی کیشنز لاہور، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء،ص:۵۶

۳ ۔ ایضاً،ص:۱۲۸

۴ ۔ ایضاً،ص:۱۵۰

۵ ۔ ایضاً، ص: ۲۲۰

۶ ۔

https://m.facebook.com/story.php?stary_fbid=102212125
11923286&id=1260581814

۷ ۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا،صریر پبلی کیشنز لاہور، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص:۱۸۶

۸ ۔ ایضاً،ص:۱۱۲

۹۔ ایضاً،ص:۱۷۸

۱۰ ۔ https:?PHP.com/stroy.fb.m//stroy-FB=
102212125119232286&id1260581814

۱۱ ۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا،صریر پبلی کیشنز، لاہور، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء،ص:۲۶۱

۱۲ ۔ ایضاً،ص:۲۶۴

۱۳ ۔ ایضاً،ص:۲۵۹

۱۴ ۔ ایضاً،ص:۱۷

۱۵ ۔ ایضاً،ص:۲۳۶

۱۶ ۔ ایضاً،ص:۲۱۳

۱۷ ۔ ایضاً،ص:۲۲۵

۱۸ ۔ ایضاً،ص:۱۱۵

۱۹ ۔ ایضاً،ص:۲۳

۲۰ ۔ ایضاً،ص:۲۵

۲۱ ۔ ایضاً،ص:۵۱

۲۲ ۔ ایضاً،ص:۱۴۸

۲۳ ۔ نازغہ قندیل، اردو ناول میں زوالِ فطرتِ انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، مثال پبلشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص:۱۴۰

۲۴ ۔ مشرف عالم ذوقی، پو کے مان کی دنیا، صریر پبلی کیشنز، لاہور، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء، ص:۶

۲۵ ۔ ایضاً،ص:۴۵

۲۶ ۔ ایضاً،ص:۴۸

۲۷ ۔ ایضاً،ص:۱۱۳

۲۸ ۔ ایضاً،ص:۱۳۹

۲۹ ۔ ایضاً،ص:۱۷

۳۰ ۔ ایضاً،ص:۱۶۵

۳۱ ۔ ایضاً،ص:۱۲۳

۳۲ ۔ ایضاً،ص:۱۲۷

۳۳ ۔ ایضاً،ص:۶۱

۳۴ ۔ ایضاً،ص:۶۲

۳۵ ۔ ایضاً،ص:۱۸۱

۳۶ ۔ ایضاً،ص:۱۸۸

۳۷ ۔ ایضاً،ص:۹

۳۸ ۔ ایضاً،ص:۶۰

۳۹ ۔ ایضاً،ص:۲۵۵

۴۰ ۔ ایضاً،ص:۲۶۵

۴۱ ۔ https://m.facebook.com/story.php?stary_fbid=102212125 11923286&id=1260581814

۴۲ ۔ مشرف عالم ذوقی، پو کے مان کی دنیا،صریر پبلی کیشنز،لاہور،راولپنڈی،۲۰۱۹ء،ص:۵۹

۴۳ ۔ ایضاً،ص:۱۴۲

۴۴ ۔ ایضاً،ص:۱۳۰

۴۵ ۔ ایضاً،ص:۲۱

۴۶ ۔ ایضاً،ص:۲۲

۴۷ ۔ ایضاً،ص:۲۵۵

۴۸ ۔ ایضاً،ص:۲۶۶

۴۹ ۔ مشرف عالم ذوقی، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، ساشا پبلیکیشنز، دہلی،۲۰۰۵ء، ص:۱۲

۵۰ ۔ ایضاً،ص:۳۲۳

۵۱ ۔ ایضاً،ص:۳۲۳

۵۲ ۔ ایضاً،ص:۳۲۷

۵۳ ۔ ایضاً،ص:۲۴۸

۵۴ ۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۵۵ ۔ ایضاً،ص:۳۳۱

۵۶ ۔ ایضاً،ص:۳۳۳

۵۷ ۔ ایضاً،ص:۲۲۲

۵۸ ۔ ایضاً،ص:۲۷۴

۵۹ ۔ ایضاً،ص:۳۱۱

۶۰ ۔ ایضاً،ص:۳۱۳

۶۱ ۔ ایضاً،ص:۴۰

۶۲ ۔ ایضاً،ص:۱۱۴

۶۳ ۔ ایضاً،ص:۲۵۹

۶۴ ۔ ایضاً،ص:۵۱۸

۶۵ ۔ ایضاً،ص:۴۷

۶۶ ۔ ایضاً،ص:۴۹

۶۷ ۔ ایضاً،ص:۷۳

۶۸ ۔ ایضاً،ص:۸۵

۶۹ ۔ ایضاً،ص:۲۹۶

۷۰ ۔ ایضاً،ص:۷۶

۷۱ ۔ ایضاً،ص:۵۰۰

۷۲ ۔ ایضاً،ص:۱۹۷

۷۳ ۔ ایضاً،ص:۲۰۰

۷۴ ۔ ایضاً،ص:۲۰۴

۷۵ ۔ ایضاً،ص:۲۲۳

۷۶ ۔ ایضاً،ص:۱۸۱

۷۷ ۔ ایضاً،ص:۱۸۲

۷۸ ۔ ایضاً،ص:۱۲۵

۷۹ ۔ ایضاً،ص:۱۹۶

۸۰ ۔ ایضاً،ص:۲۷۹

۸۱ ۔ ایضاً،ص:۲۸۶

۸۲ ۔ ایضاً،ص:۳۶۷

۸۳ ۔ ایضاً،ص:۳۷۶

۸۴ ۔ ایضاً،ص:۴۱۹

۸۵ ۔ ایضاً،ص:۴۶۳

۸۶ ۔ ایضاً،ص:۴۷۷

۸۷۔ ایضاً،ص:۴۸۸

۸۸۔ ایضاً،ص:۱۴

۸۹۔ ایضاً،ص:۲۲

۹۰۔ ایضاً،ص:۳۴

۹۱۔ ایضاً،ص:۱۹۷

۹۲۔ ایضاً،ص:۱۹۷

۹۳۔ ایضاً،ص:۲۵۰

۹۴۔ ایضاً،ص:۱۵۵

۹۵۔ ایضاً،ص:۳۰

۹۶۔ ایضاً،ص:۳۴

۹۷۔ ایضاً،ص:۱۶

۹۸۔ ایضاً،ص:۲۷

۹۹۔ ایضاً،ص:۱۲۷

۱۰۰۔ ایضاً،ص:۱۱۷

۱۰۱۔ ایضاً،ص:۳۶۲

۱۰۲۔ ایضاً،ص:۴۸۴

۱۰۳۔ مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ،ساشا پبلیکیشنز، دہلی،۲۰۰۸ء، ص:۳۶۳

۱۰۴۔ ڈاکٹر منظر اعجاز، چہارسو ماہنامہ، بانی مدیر سید ضمیر جعفری، راولپنڈی، جلد ۲۶،شمارہ جنوری،فروری، ۲۰۱۷ء، ص:۳۲

۱۰۵۔ ایضاً، ص:۴۲

۱۰۶۔ ایضاً، ص:۲۸

۱۰۷۔ مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ،ساشا پبلیکیشنز، دہلی۲۰۰۸ء،ص:۲۳

۱۰۸۔ ایضاً،ص:۳۸

۱۰۹۔ ایضاً،ص:۴۲

۱۱۰ ۔ ایضاً،ص:۶۹

۱۱۱ ۔ ایضاً،ص:۱۲۲

۱۱۲ ۔ ایضاً،ص:۳۶۲

۱۱۳ ۔ ایضاً،ص:۴۳۴

۱۱۴ ۔ ایضاً،ص:۴۳۲

۱۱۵ ۔ ایضاً،ص:۴۳۸

۱۱۶ ۔ ایضاً،ص:۱۳

۱۱۷ ۔ ایضاً،ص:۱۳

۱۱۸ ۔ ایضاً،ص:۴۶۴

۱۱۹ ۔ ڈاکٹر مشتاق احمد، جدید حسیت کا فکشن نگار: ذوقی، ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی،۲۰۱۴ء،ص:۴۱

۱۲۰ ۔ مشرف عالم ذوقی، لے سانس بھی آہستہ، ساشا پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۸ء،ص:۵۱

۱۲۱ ۔ ایضاً،ص:۵

۱۲۲ ۔ ایضاً،ص:۲۲

۱۲۳ ۔ ایضاً،ص:۳۹۰

۱۲۴ ۔ ایضاً،ص:۴۲۸

۱۲۵ ۔ ایضاً،ص:۴۷۱

۱۲۶ ۔ ایضاً،ص:۴۷۱

۱۲۷ ۔ ایضاً،ص:۴۷۳

۱۲۸ ۔ ایضاً،ص:۴۶۷

۱۲۹ ۔ ایضاً،ص:۴۸۲

۱۳۰ ۔ ایضاً،ص:۴۴۱

۱۳۱ ۔ ایضاً،ص:۴۴۳

۱۳۲ ۔ ایضاً،ص:۳۵۰

۱۳۳ ۔ ایضاً،ص:۱۰

۱۳۴ ۔ ایضاً،ص:۴۶۸

۱۳۵ ۔ ایضاً،ص:۷۲

۱۳۶ ۔ ایضاً،ص:۷۳

۱۳۷ ۔ ایضاً،ص:۷۵

۱۳۸ ۔ ایضاً،ص:۷۵

۱۳۹ ۔ ایضاً،ص:۸۹

۱۴۰ ۔ ایضاً،ص:۲۶

۱۴۱ ۔ ایضاً،ص:۳۷۰

۱۴۲ ۔ ایضاً،ص:۶۳

۱۴۳ ۔ ایضاً،ص:۳۴

۱۴۴ ۔ ایضاً،ص:۱۰۴

۱۴۵ ۔ ایضاً،ص:۱۲۴

۱۴۶ ۔ ایضاً،ص:۴۰۵

۱۴۷ ۔ ایضاً،ص:۴۶۲

۱۴۸ ۔ ایضاً،ص:۴۷۹

باب چہارم :

مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری (۲۰۱۰ء سے تاحال) فنی وفکری جائزہ

ا ۔ ''آتشِ رفتہ کا سراغ''
ب ۔ ''نالۂ شبِ گیر''
ج ۔ ''مرگِ انبوہ''

آتشِ رفتہ کا سراغ

۷۱۹ صفحات پر مشتمل یہ ناول" آتشِ رفتہ کا سراغ" ہندوستان کے مسلمانوں کی آپ بیتی ہے، ۲۰۱۳ء میں یہ ناول منظر عام پر آیا تو ادبی دنیا میں اس پر اکثر نقادوں نے اپنی آراء کا اظہار کیا، ذوقی نے خود ناول کی ابتدا میں پیش لفظ لکھ کر اُس میں اس ناول کے محرکات کا مختصر جائزہ لیا ہے تا کہ قاری ناول کے پسِ منظر تک پہنچ سکے، ذوقی کے نظریات ان کی اپنی زبانی ملاحظہ کریں۔

"میں نے ایک چھوٹی سی آواز بلند کرنے کی ہمت کی ہے۔اس میں تلاش ماضی کے بلیغ استعارے نہ سہی، اس میں آج کی آواز تو شامل ہے۔ میں نہیں جانتا، اردو دنیا میں اس ناول کا استقبال کیا جائے گا یا نہیں۔۔۔اب یہ ناول آپ کے سامنے ہے۔اس یقین کیساتھ کہ نئی دنیا سے اس بے رنگ اور بے رحم تحفے کو آپ تک پہنچاتے ہوئے مجھے کوئی خوشی نہیں ہے لیکن ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ میں نے اپنی بات آپ تک پہنچانے کی جرات ضرور کی ہے۔" [۱]

ذوقی اس ناول کے پسِ منظر سے جس تلخ حقیقت کا ادراک کروانا چاہتے ہیں اس کا اشارہ وہ ناول کے انتساب میں ہی کر دیتے ہیں۔

"اس عالمی سیاست کے نام بھی جہاں پر مسلمان خوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔"

ذوقی نے اس ناول میں بے حد عمدگی کے ساتھ ہندوستان کی تلخ سچائیوں کا پردہ فاش کیا ہے انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حقیقی تصویر کشی کی ہے ناول کے پیشِ لفظ میں انہوں نے اس جدوجہد کا تعارف کروایا جو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے طویل عرصے سے کر رہے ہیں انہیں اس بات کا بھی شدت سے احساس ہے کہ مسلمانوں کی شاندار تاریخ کو اسامہ بن لادن، لشکر طیبہ اور جیش کا نام دے کر مسلمانوں کی قربانیوں اور وفاداریوں کے پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے، اس ناول" آتشِ رفتہ کا سراغ" سے پہلے بھی ذوقی مسلمانوں کو درپیش مسائل کی طرف اشارہ کرتے رہے ہیں اس موضوع پر ان کے تین اور ناول ذبح، بیان اور مسلمان بھی لکھے جا چکے ہیں۔

ذوقی نے یہ ناول عصرِ حاضر کے ہندوستانی مسلمان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی کرنے کے لئے لکھا ہے جس میں انہوں نے بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کا سہارا لیا مگر وہ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

وہ خود اس بات کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ اصل بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر پر روشنی ڈالنا ضروری ہے جس کے گرد اس ناول کی کہانی گردش کرتی ہے۔

۱۹ستمبر کی صبح جامعہ نگر کے علاقے بٹلہ ہاؤس میں ایک انکاؤنٹر کیا گیا جس میں دہلی پولیس نے دو مبینہ دہشت گردوں (عاطف امین اور محمد ساجد) کو مارنے کا دعویٰ کیا ساتھ میں ایک پولیس انسپکٹر کے شدید زخمی ہونے کی اطلاع بھی دی گئی اور دو لوگوں کے فرار ہونے کی خبر بھی دی گئی جس کی بنا پر پولیس نے جامعہ نگر دہلی کے کئی علاقوں اور اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ سے ایک درجن مسلمان نوجوان کو گرفتار کیا اور انہیں "انڈین مجاہدین" نامی تنظیم سے جوڑ کر دہشت گرد ہونے کا دعوی کیا۔

واضح رہے کہ ان دونوں مسلمان نوجوانوں کو ۱۳ستمبر ۲۰۰۸ء دلی میں ہونے والے سلسلہ وار بم دھماکوں کے الزام میں مارا گیا مگر آج دس سال گزر جانے کے بعد بھی پولیس کو اس کیس میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ ۱۳ستمبر کے بلاسٹ میں ان دونوں نوجوانوں کا ہاتھ تھا بھی یا نہیں، انہیں شک کی بنا پر شہید کر دیا گیا اور درجنوں نوجوانوں کو یا تو غائب کر دیا گیا یا گرفتار کر کے نامعلوم جگہوں پر بھیج دیا گیا۔

حقوقِ انسانی کی تنظیموں اور ملزمین کے لواحقین نے پولیس کے طریقہ کار اور دعوؤں کو جھوٹا قرار دیا جس سے معاملہ کچھ عرصہ اخبارات کی زینت بنا مگر اُس وقت کی حکومتی جماعت کانگریس نے اس معاملے کو دبانا چاہا کیونکہ اگر حقائق سامنے آجاتے تو پولیس کا گھناؤنا چہرہ سب کے سامنے آجاتا، آج دس سال کا عرصہ گزر جانے پر بھی اس معاملے کا فیصلہ نہیں کیا گیا اور آج بھی یہ کیس دہلی کی اسپیشل کورٹ میں چل رہا ہے، گرفتار ہونے والے نوجوانوں کے بہت سے قریبی عزیز صدمہ کی وجہ سے دنیا چھوڑ گئے اور اس صدمے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہیں ایک سے زیادہ مقدمات میں پھنسایا گیا تاکہ ایک سے اگر چھٹکارا پائیں تو دوسرا گلے پڑ جائے گا ساری زندگی جیل کی کال کوٹھڑی ان کا مقدر بنے گی اور اگر کبھی ان تمام مقدمات سے بری ہو بھی گئے تب زندگی برباد ہو چکی ہوگی۔

یہ انکاؤنٹر مبینہ اور فرضی تھا جس میں ہلاک ہونے والے انسپکٹر موہن چند شرما کی موت پر بھی بہت سوالات اٹھائے گئے مگر حکومت کی طرف سے حال ہی میں اسے بہادری ایوارڈ دیا گیا جس سے تمام ہندوستانی مسلمانوں کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے۔

ذوقی نے کمال مہارت سے اپنے ناول میں اس کہانی کا نیا روپ دکھایا ہے اور اس فرضی انکاؤنٹر کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے پیچھے بابری مسجد کا فیصلہ گردش کرتا ہے اس انکاؤنٹر کے کچھ عرصہ بعد ہی بابری مسجد کا فیصلہ

بھی آ جاتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے مگر اس ناول میں ذوقی نے مسلمانوں کو پرامن دکھایا ہے، وہ دل سے دکھی ہوتے ہیں کہ مسجد کی جگہ مندر بننے جا رہا تھا مگر وہ خوش تھے کہ اگر فیصلہ ان کے حق میں ہو جاتا تو ان کے خون سے ہولی کھیلی جاتی اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"سارے ملک میں مسلمان جشن منا رہے ہیں۔ ٹی وی دیکھو۔ مٹھائیاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ دنگے نہیں ہوئے۔ شانتی رہی ۹۲ نہیں دہرایا گیا۔ یہ مٹھائی نہیں تقسیم کی جا رہی ہیں دوست۔ تم سے ایک حقیقت بتائی جا رہی ہے کہ ہم ہر حال میں خوش ہیں۔ " [۲]

بابری مسجد فیصلے کے بعد ہندوستان کا نقشہ اس ناول میں ذوقی نے خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔

" آتشِ رفتہ کا سراغ" صرف بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر ہو رہے مسلسل ظلم و ستم کا اس ناول کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی سرزمین آزادی کی ابتداء سے ہی ایک عام مسلمان ہندوستانی کے لئے تنگ ہوتی ہوئی نظر آئی ہے، ہندوستانی مسلمانوں کو آئے روز جس طرح کی مشکلات برداشت کرنی پڑ رہی ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، پوری دنیا اس سے واقف ہے ہندوستان میں ہندو جنتا کے راج میں بہت کم لوگوں کی ہمت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کریں اور مظلوم کے لیے حق کی بات کریں مگر مشرف عالم ذوقی کی کوئی بھی تحریر اٹھا کر دیکھیں انہوں نے کہیں پر بھی ڈر یا خوف کی وجہ سے حقیقت کو پسِ پشت نہیں ڈالا بلکہ مکمل غیر جانبداری سے لکھتے رہے ہیں۔

"میں کہہ سکتا ہوں، یہاں میں آزادی اظہار کا اعلان کرتے ہوئے ہر طرح کے تیر و کمان سے لیس تھا۔۔۔اس لئے مجھے ان ادبی فتووں کا ڈر نہیں کہ سیاسی شعور کو کچھ لوگ ابھی بھی رپورٹنگ کا درجہ دیتے ہیں۔"

ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کے لیے ہر پل مشکلات نظر آتی ہیں جس کی عکاسی اس ناول میں بھی کی گئی ہے، چار دوست نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں اور واپسی پر موت کا خوف اپنے ساتھ لاتے ہیں ایک پولیس کے سپاہی سے معمولی طور پر الجھنے کی سزا میں اسامہ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس سسٹم سے دلبرداشتہ ہو کر وہ خود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے جس کی وجہ صرف وہ خوف ہے جو اس ماحول نے اس پر حاوی کر دیا ہوتا ہے، اپنے عزیز دوست کی موت کی خبر سنتے ہی اسے اپنی موت کی آہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔

"اب سارے منظر گم تھے۔ بدن میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اسامہ پاشا اندر ہی
اندر خوف بھی محسوس کر رہے تھے۔ جیل کی سلاخوں سے پھانسی کے پھندے تک،
سب کچھ نظروں کے سامنے تھا۔ مگر سب سے بڑا سوال تھا۔ قصور اس کا قصور کیا
ہے؟ [۳]

اس اقتباس سے نہ صرف صورت حال سامنے آ جاتی ہے بلکہ بے بسی بھی نظر آتی ہے کہ نئی نسل کے لیے ہندوستان جس طرح کے دلدل قائم کر رہا ہے یہ تباہ کن ہیں۔

ناول میں ایک ضمنی کہانی جو کہ انسپکٹر ورما کے توسط سے بیان کی گئی ہے ایک بے گناہ مسلمان گھرانے کی کہانی ہے، رشید نام کے مسلمان کردار سے اقبالِ جرم کروانے کے لیے اس کے اور اس کے خاندان کے ساتھ جس طرح کا جسمانی اور ذہنی تشدد کیا جاتا ہے وہ کسی المیہ اور بھیانک سچائی سے کم نہیں جسے پڑھتے ہوئے قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں واقعات زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں زیرِ بحث ناول کی کہانی سے متعلق بھی اکثر واقعات تاریخ کا حصہ ہیں جس کی طرف ذوقی نے اشارہ بھی کیا ہے۔

ہندوستانی پولیس کے حوالے سے آئے روز ایسے واقعات سننے کو ملتے رہتے ہیں کہ وہ کس بے رحمی سے ہندوستانی مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے رہتے ہیں، اس حوالے سے ذوقی نے زیرِ بحث ناول میں آواز اٹھائی ہے اور ان نام نہاد محافظوں کا پردہ فاش کیا ہے جو نہ تو عورتوں کا احترام کرتے ہیں، نہ بزرگوں کا، اقتدار کے نشے میں یہ ہندو قوم مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں جس پر قلم اٹھا کر ذوقی نے اس ہندو سسٹم کا منہ کالا کر دیا ہے جو برابری کے دعوے تو کرتے ہیں مگر ستر برسوں میں ایک مسلمان کو بھی برابری کا درجہ نہیں دے پائے۔

مشرف عالم ذوقی صرف ناول لکھنے کی غرض سے یا ادبی دنیا میں مقام حاصل کرنے کیلئے نہیں لکھتے بلکہ وہ زندگی کے کھرے کھوٹے کے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے حقائق کو بیان کرنا چاہتے ہیں جس کیلئے انہوں نے ناول کی صنف کا انتخاب کیا اسی لیے تکنیکی اور فنی اعتبار سے ان کے ناول کامیاب ہوتے ہیں اس ناول کو بھی انہوں نے کمال مہارت سے ترتیب دیا ہے۔

ہندوستان میں رہنے والے مسلمان مجبوری، بے بسی اور لاچاری کی مانند زندگی گزارنے پر مجبور ہیں کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہے، ان کی امیدیں وقت کے ساتھ ساتھ منہدم ہوتی جا رہی ہیں مسلمانوں کا دیکھا ہوا کوئی بھی خواب مکمل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا، بابری مسجد کے فیصلے سے بھی مسلمانوں کو بہت سی امیدیں تھیں اس حوالے سے ایک کردار کی

زبانی مسلمانوں کی سوچ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ملاحظہ کریں۔

> "شاید تم اس سچ کو اس کی گہرائی سے نہیں سمجھ پاؤ گے تھا پڑ کہ مجھے اس فیصلے میں اپنی چھوٹی سی مضبوطی کی امید کیوں نظر آ رہی ہے۔ لیکن ۶۴ برسوں سے ہم امید لگائے اپنی حمایت میں ہونے والے ایک فیصلے کے منتظر ہیں۔" [۴]

ہندوستانی مسلمانوں کی بدنصیبی کہ ان سے ملک کی تقسیم کے بعد سے ہی امتیاز کا سلوک کیا گیا ذوقی نے مسلمانوں کی حالتِ زار کو محور بنا کر یہ ناول تحریر کیا ہے جس کے مطالعہ سے ہر جگہ ایک تلخ سچائی کا سامنا کرنا پڑا ہے زیرِ بحث ناول میں سچائی پر مشتمل مختلف واقعات سامنے آتے ہیں جن سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا ایسے واقعات میں ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ، گجرات کے فسادات، پاکستان میں ہونے والی انتہا پسندی سے متعلق واقعات اور بمبئی کا دہشت گردانہ حملہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس ناول کی کہانی ہر ہندوستانی مسلمان گھرانے کی کہانی ہے جس پر اس سے پہلے کسی نے بھی قلم نہیں اٹھایا۔ ذوقی نے ایک اور خاص پہلو اٹھایا ہے جس کی وجہ سے ذوقی کے خیالات کو بہت پسند کیا گیا ہے انہوں نے ایک کردار اسامہ کے ذریعے جو انسانیت کا سبق دیا ہے اس کی مثال قائم کرنا بہت مشکل ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا مذہب انسانیت ہے جس میں انسانیت ہی نہ ہو وہ کیا خاک کسی اور مذہب کا پالن کر پائے گا اس حوالے سے ذوقی نے جو انسانیت کا پیغام دیا ہے اس نے ناول کو چار چاند لگا دیے ہیں، ذوقی نے قاری کے لیے چند سوالات بھی چھوڑے ہیں کہ جہاں ایک انسان ہی دوسرے انسان کے خون کا پیاسا ہو، جہاں پر عورت کو عورت نہیں سمجھا جائے، عزت نہ دی جائے وہاں مذہب کا کیا کام۔

اس ناول میں ذوقی نے ہندوستانی مسلمانوں کی تصویر کشی کی ہے تب ہی تو اس کو ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی کہا جاتا ہے کیونکہ معاشرہ، سماجی، تہذیبوں کے تصادم اور مسلمانوں کو درپیش مسائل کا جو مکالمہ ذوقی نے پیش کیا ہے وہ اور کہیں نہیں نظر آتا، یہ ذوقی کا ہی ہنر ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو ستر برسوں کی دردناک داستان لکھی ہے جس میں ماضی کی ساعتیں بھی ہیں جو عظیم انسانی تاریخ کی غماز ہیں اور دوسری طرف ہندوستانی مسلمانوں کے عصرِ حاضر کے مسائل اور مشکلات بھی بیان کر دی ہیں۔

اس ناول کی کہانی خدشات کی کہانی ہے اسامہ نام کے کردار کا چننا درحقیقت اس بات کا پردہ فاش کرنا ہے کہ ایک انسان کے دہشتگرد ہونے سے تمام لوگوں کو اس زمرے میں نہیں دیکھا جا سکتا، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے انہدام کے بعد اسامہ بن لادن اور اس گروہ کے مزید لوگوں کی وجہ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو دہشتگرد سمجھا جانے لگا جس کا سب

سے زیادہ اثر ہندوستانی مسلمانوں پر ہوا، جس وجہ سے فرقہ پرستی نے جنم لیا اور ہندوستان جو سیکولر ریاست کے طور پر جانا جاتا ہے وہاں مسلمانوں کے لئے نفرت پیدا کر دی گئی اور خاص طور پر نو آبادیاتی نظام سے آزاد ہونے کے بعد استعماری قوتیں مظبوط ہوئیں اور ہندو مسلم بھائی چارہ کو نہ صرف نیست و نابود کر دیا بلکہ نفرت کی ایک مضبوط دیوار بھی کھڑی ہو گئی۔

ذوقی نے اسامہ نام کے کردار کا اس لیے استعمال کیا تاکہ دنیا کو بتایا جا سکے کہ ایک اسامہ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور کروڑوں مسلمان دہشت گرد نہیں ہو سکتے۔

ناول کے آخری حصے کے بارے میں اکثر لوگوں کی آراء ہے کہ اسے اردو ناول کی ایک نئی تاریخ کا آغاز کہا جا سکتا ہے۔

ناول کی آغاز میں راوی نہ صرف اپنے خاندانی پسِ منظر کو بیان کرتا ہے بلکہ ان کے الفاظ سے درحقیقت تقسیم کے بعد آنے والی تبدیلی کی جھلک بھی نظر آتی ہے، تیز بھاگتی ہوئی زندگی کی دوڑ میں اپنا الگ مقام بنانا اور ان سب سے بڑھ کر رشتوں کا زوال اور تقسیم کا دکھ ان تمام موضوعات کو اس ناول میں کمال مہارت سے پرو دیا ہے۔

ذوقی کے تمام ناولوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی پائی جاتی ہے کہ تقسیم کا المیہ ہر جگہ سر کھولے کھڑا ہوتا ہے، اس کی وجہ شاید تقسیم کے بعد پیش آنے والے واقعات ہیں، ہزاروں لوگوں کے اپنے جدا ہوئے، لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے، کتنی بہنوں اور بیٹیوں کی عزتیں لوٹی گئیں، کتنی عورتوں سے ان کے نومولود بچے چھین لے گئے، تاریخ گواہ ہے ان سب واقعات کی۔

اس موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے لفظ ختم ہو سکتے ہیں مگر اس خونی تقسیم کو بیان نہیں کیا جا سکتا اسی درد و کرب کی وجہ سے آج تقسیم کو ستر دھائیاں گزر جانے کے باوجود بھی ایک ہندوستانی مسلمان کے ذہن سے تقسیم کا خیال نہیں نکل پاتا، ذوقی کے اندر بھی یہ درد و کرب کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوا ہے جو ان کی ہر تحریر میں کسی نہ کسی روپ میں سامنے آ ہی جاتا ہے اس ناول کے کردار بھی تقسیم کا رونا روتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اقتباسات ملاحظہ کریں جن سے ذوقی کے خیالات کو جلا بخشی گئی ہے۔

> "مجھے یاد آیا، ایسے ہی بھیانک ماحول میں میری بھی پرورش ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد بھڑکتے ہوئے دنگے کبھی رکے ہی نہیں۔ پیدا ہوا تب بھی فساد کی چنگاریاں روشن تھیں۔۔۔" [۵]

> "تقسیم کو ایک مدت گزر چکی ہے۔ اس ملک کے باقی لوگ تقسیم کے زہر کو بھول چکے

ہیں۔بس ایک تم رہ گئے ہوارشد پاشا۔ٹوٹتے ہویا ہارتے ہو۔مرتے ہویا زخمی
ہوتے ہوتو سیدھے تقسیم تک پہنچ جاتے ہو۔" [٦]

پاکستان کے بننے پر جہاں پاکستانی مسلمانوں کیلئے خوشی کی بات تھی وہیں ہندوستانی مسلمانوں کواس کا بھاری حساب چکانا پڑا،انہیں نہ صرف دوسرے درجے کی شہریت دی گئی بلکہ ہندوستانی عوام اور حکمرانوں کے ہاتھوں آئے روز انہیں زلالت ملتی رہتی ہے جس پر ذوقی نے اس ناول میں آواز اٹھائی ہے اس حوالے سے ایک کردار کے خیالات کا اظہار ناول میں کیا گیا ہے ملاحظہ کریں۔

"یہ تمہاری بات سولہ آنے سچ ہے۔ایک پاکستان کیا بنا،دلوں کے ٹکڑے ہو گئے...
اپنے تو ٹکڑے کر کے چلے گئے۔یہاں بھی شرمسار ہوئے کہ میاں تم نے تو اپنا ملک
لے ہی لیا اب کرایہ دار بن کر زندگی جیو...ہاں میاں لعنت ہے ان مسلم نیتاؤں کی
سوچ پر جن کے ذہن میں پاکستان بنانے کا خیال آیا تھا۔" [۷]

تقسیم کے بعد ہندو مسلم فسادات ایک عام سی بات ہے ذوقی نے اس ناول میں اس سے جڑے ایک اور پہلو کو بھی بیان کیا ہے کہ ان فسادات میں جہاں ہندو مسلمان دونوں مذاہب کے ماننے والوں کا خون بہایا گیا وہیں کچھ ایسے بے گناہ لوگ بھی مارے گئے جن کا مذہب اور مذہب کے پیشواؤں کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا پر تاریخ کا ستم کہ ان کو بھی مذہب کے نام پر موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے ایسے ہی ایک کردار بدر کو ذوقی نے اس ناول میں متعارف کروایا ہے جو ان تمام لوگوں کی داستانِ غم بیان کرتا ہے جو بے گناہ اس نفرت کا انتقام بنے اور جو تقسیم کے بعد ہندوستانیوں کے خون میں رچ بس گئی ہے اس کی وضاحت کے لیے ناول کے اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"میں مارا جاؤں گا تو...؟ کون بتائے گا کہ میری آئیڈیالوجی کیا تھی؟ میں تو مارکسٹ
تھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے...جمہوری اور اشتراکی نظریہ کو زندگی سمجھنے والا۔
جسے مذہب کے نام پر مار دیا گیا۔" [۸]

"بدر کے آنسو ابھی بھی اس کی آنکھوں میں لہرا رہے ہیں...میں تو مارکسٹ تھا...میں
مر جاؤں گا تو...؟ کون بتائے گا انہیں کہ میری آئیڈیالوجی کیا تھی ... کلمہ یاد ہے ...
کیا معلوم اوپر جنت جیسی کوئی شے ہو۔" [۹]

ذوقی نے طنزیہ زبان کا استعمال کیا ہے ,ایسے طنزیہ نشتر چلائے ہیں کہ سب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے حقیقت پسندی کا سہارا لے کر لکھا ہے جس کی وجہ سے انہیں کچھ مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔ آزادانہ اظہارِ خیال کرنے پر ذوقی کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا یا وہ اب بھی کر رہے ہیں اس کے بارے میں

ناول کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں کہ انہیں ۲۰۰۳ء میں رات کے گیارہ بجے کچھ پولیس والے تھانے لے گئے جہاں انہیں کچھ بے ہودہ سوالات کا سامنا کرنا پڑا مگران کے بدلے میں جواب قابلِ ستائش ہے ملاحظہ کریں۔

"اگر میں اس ملک کے لیے وفادار نہیں تو اس ملک کے لیے کوئی بھی وفادار
نہیں ہوسکتا۔" [۱۰]

ناول میں ذوقی نے طنزیہ گفتگو کا سہارا لے کر حقائق بیان کیے ہیں اس حوالے سے ناول کے اہم اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"یہاں ایک کھلاڑی جوتے پر انجانے میں اپنے دستخط کسی کمپنی کو بیچتا ہے اور تمہارے
چار داڑھی والے ملاّ اسے پبلک ایشو بنا لیتے ہیں۔جھٹ سے اللّٰہ اور ایشور کی بے حرمتی
پر تیور چڑھ جاتے ہیں مگر تب... جب ڈھابے کے تندور میں کوئی عورت جلائی جاتی ہے؟
کوئی دیوا داس جین رشی مینوں کے آشرم میں روز ہی بلا اتکار۔۔۔" [۱۱]

"شاید یہ سب اس سیکولر ملک میں ہی چلتا ہے جہاں قاتل نیتا کہلاتے ہیں۔سانپوں کی
دودھ پلا کر پرورش کی جاتی ہے ... جہاں فرقہ واریت کی کوکھ سے جنمی پارٹی عوام کی
پارٹی کہلاتی ہے۔حکومت بناتی ہے... اور تاش کے باون پتوں کو بکھیر کر اپنی من مانی
اور کاموں پر نہال ہوتی رہتی ہے۔۔۔شاید اس جمہوری ملک کا یہی نصیب ہے۔" [۱۲]

اس ناول میں ذوقی نے حالات کی سنگینی کا احساس تمام مسلمانوں کو دلانے کی پوری کوشش کی ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو جن شدید ترین حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ نام نہاد مسلمان بھی ہندو تنظیموں کے مہرے بن چکے ہیں، ان کے لئے مسلمانوں کے خواب کوئی معنی نہیں رکھتے اپنے ذاتی مفادات کے لیے ایسے لوگ اپنے زمیر کا سودا کرنے سے نہیں کتراتے، ذوقی نے اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب مسلمانوں کی قیادت کرنے والے خود ہندوؤں کے آلہ کار ہوں تو وہ پھر مسلمانوں کے لیے کوئی آسانی نہیں پیدا کر سکتے بلکہ ایسے میں مسلمانوں کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جاتی ہے انہوں نے ایک کردار کے ذریعے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

"وہ امام صاحب... اور وہ ہندو مہا سبھا کے لوگ۔۔۔اور اچانک میں ٹھہر گیا
ہوں... مسجد کمیٹی کے سنجیدہ نظر آنے والے چہرے... ہندو مہا سبھا اور مندر کمیٹی
کے لوگوں کے ساتھ ٹھہاکے لگاتے ہوئے۔" [۱۳]

کرداروں کی زبان سے ہی ذوقی نے ان کی اصلیت بیان کروائی ہے جس سے قاری نہ صرف سکتے میں آجاتا ہے

بلکہ اپنے اردگرد موجود نام نہاد اسلام کے ٹھیکیداروں کی اصلیت جاننے کا جذبہ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔

"یہاں سب دوست ہیں۔عوام کے لئے جو چہرہ ہو۔وہ عوام جانیں۔سب کو اپنے
اپنے تاش کے پتے دیئے گئے ہیں اور سب اسی پتے کی حکومت تسلیم کر رہے ہیں...
ہم اور آپ بھی وہی کر رہے ہیں۔" [۱۴]

ذوقی نے اکثر جگہوں پر تاریخ کے اوراق کو بھی پلٹ دیا ہے ان کے تمام ناولوں میں یہ فکر نظر آتی ہے، زیرِ نظر ناول میں بھی وہ اکثر علاقوں کے پسِ منظر میں جاتے ہوئے فائدہ مند معلومات قاری تک پہنچاتے ہیں جس سے نہ صرف ناول کی باریکی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے بلکہ ان کی تاریخ سے خاص شغف رکھنے کی بھی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

"اس شہر کا قدیم نام مایا تھا۔مایا پوری۔مایا پوری کو دھرتی کا نابھی استھل کیا جاتا ہے۔
یعنی انسانی جسم میں ناف کو جو حیثیت حاصل ہے وہی دنیا کے نقشے میں ہری دوار کو۔۔۔
یہ بھگوان بدری ناتھ دھام جانے کا دروازہ ہے۔اس لیے اس جگہ کو ہری دوار کہا گیا۔" [۱۵]

ہندوستان کی تاریخی عمارات اور خاص طور پر وہاں موجود قدیم مندروں کے بارے میں کچھ کہانیاں سنائی جاتی ہے۔ جونہ جانے کب سے ان سے منسلک ہیں اور ہندو مذہب کا حصہ مانی جاتی ہیں ذوقی نے زیرِ نظر ناول میں جہاں مندروں کی قدامت کا ذکر کیا تو وہیں ان کہانیوں کو بھی شامل کیا ہے جس سے نہ صرف ذوقی کے وسیع مطالعہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ناول کے مقامیت میں بھی اضافہ کا موجب بنتا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں۔

" کسی کسی شہر سے کیسی کیسی کہانیاں وابستہ ہوجاتی ہیں۔یہیں ہری دوار کے نیل پروت
پر بیٹھ کر شیو نے منتھن میں نکلا ہوا ہل' پیا تھا۔زہر بھی وش کو کنٹھ یعنی گلے میں روک کر
شیو، نیل کنٹھ بن گئے۔۔۔کہتے ہیں وش کا ناپ مٹانے کے لیے شیو نے گنگا کی جس
لہر میں غوطے لگائے، وہ لہر اب بھی نیل لہر بن کر بہہ رہی ہے۔" [۱۶]

ذوقی نے ناول میں فلسفیانہ رنگ کا بھی بے دھڑک استعمال کیا ہے۔

ناول کے آخری صفحات میں ذوقی جس تلخ حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہیں وہ ناول کا سب سے زیادہ جاندار حصہ ہے جہاں وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو کس طرح سے مات دینے کی کوشش میں مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال کیا جارہا ہے۔

ذوقی نے اس سچائی سے پردہ اٹھایا ہے جس سے اکثر لوگ غافل تھے کہ مسلمانوں کو اندر سے کمزور کرنے کے لئے اور ان کے رازوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دشمن نے بھیس بدل کر، ان کے قریب رہ کر ان کی اندرونی

کمزوریوں کو جاننا شروع کر دیا تا کہ وہ غالب آ سکیں۔

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں بظاہر تو ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے پر درحقیقت آج پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش اور اکثر مسلمان ملکوں میں اسلام دشمن عناصر یہی چال چل رہے ہیں جس سے لوگ واقف ہونے کے باوجود بھی آواز اٹھانے کی جرات نہیں کرتے مگر ذوقی نے اس موضوع کو زیرِ بحث لا کر سچائی پر سے پردہ اٹھا دیا ہے، انہوں نے ایک کردار کے سہارے اس ذہنیت کے لوگوں کو عیاں کر دیا ہے ملاحظہ کریں۔

> "مجھے ایک ایسی فوج چاہئیے جو اردو جانتی ہو عربی جانتی ہوں۔ صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن شریف پڑھ سکتی ہوں ان کے معنی سمجھتی ہو۔ ہمیں ایسے لوگوں کی ضرورت کم ہے جو ہندی یا سنسکرت جانتے ہیں کیونکہ وہ لوگ تو ہمارے ہیں ہی۔ جادو تو اصل میں تم لوگوں پر کرنا ہے اور تم پر حکومت کرنے کے لئے سب سے پہلے تمہیں قریب سے سمجھنا ہے۔" [۱۷]

ایسی تنظیمیں کس حد تک مسلمانوں میں اپنا زہر شامل کر چکی ہیں اس کی وضاحت مندرجہ ذیل اقتباس کے مطالعے سے ہو جاتی ہے۔

> "نماز صرف تم ہی نہیں پڑھتے۔ انہیں باضابطہ صحیح نماز پڑھنے کی ٹریننگ دی گئی ہے اور ان کی ... پیشانیوں پر جو سیاہ داغ ہیں وہ بھی نقلی نہیں۔ یہاں کچھ بھی نقلی نہیں ہے دوست۔ اب انہیں اور یجنل اسامہ ... یعنی مسلمان بنا کر تمہارے درمیان اتار رہے ہیں۔" [۱۸]

ان اقتباس کے مطالعے سے قاری کی ذہن میں ایک سوال گردش کرتا ہے کہ اس سب کے کرنے کی کیا وجہ ہے تو مصنف انہی صفحات پر ساتھ میں حقائق سامنے رکھ دیتے ہیں کہ آخر کیوں وہ لوگ اتنی تنگ و دو کر رہے ہیں۔

> "ہم تم میں گھل مل رہے ہیں... جیسے دودھ میں پانی گھل مل جاتا ہے۔ کیا دودھ میں پانی دیکھ سکتے ہو تم... ؟ ہم تم میں ایسے ہی گھل مل جائیں گے کہ تم اپنوں کی شناخت بھی نہ کر سکو۔ ہر جگہ ہر موڑ پر۔ ہم تمہارا سایہ بن کر ساتھ ساتھ چلیں گے۔ تم ہمیں پہچان بھی نہیں سکو گے اور ہم تمہارا آسانی سے شکار کر سکیں گے۔" [۱۹]

یہ اور ایسے کئی اور دل دہلا دینے والے مکالمات کو ذوقی نے ناول میں شامل کر کے حالات کی سنگینی کی وضاحت کی ہے اور ساتھ میں کچھ وقت کیلئے وہ قاری کو بھی حیرت کی وادیوں میں چھوڑ آتے ہیں۔

یہ ناول کسی المیہ سے کم نہیں جیسا کہ اس کے موضوعات کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک انسان کی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کی داستانِ حیات ہے جس کو ذوقی نے بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے جس

سے اس ناول کا شمار اردو فکشن کے اندر ایک شاندار اضافہ کے طور پر کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کے گھروں میں تو ہم پرستی عام سی بات ہے آج کے جدید دور میں بھی اکثر ہندوستانی (یہاں ہندوستان سے مراد برصغیر پاک و ہند ہے) تو ہم پرستی کا شکار ہیں ذوقی نے اپنے ناولوں میں جب جب تقسیم کے بعد کے حالات کا جائزہ لیا ہے وہ کرداروں کی تو ہم پرستی کو بیان کرتے ہیں، اس ناول میں بھی اکثر جگہوں پر کرداروں کی زبانی ایسے مکالمے ادا کیئے ہیں کہ ہندوستانی معاشرے میں رچی ہوئی تو ہم پرستی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

"نوج' صبح سے کوئے بھی کائیں کائیں کر رہے تھے۔ مجھے سب پتہ تھا کچھ نہ
کچھ ضرور ہونے والا ہے۔" [۲۰]

"بی اماں کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ جیسے شک ہو۔۔۔ مان لو یہ کوّا ہندوستان
پاکستان میں جنگ کی بری خبر لایا ہو۔ مارے تو جائیں گے بیچارے مسلمان۔۔۔
میرا دل ڈر رہا ہے۔ سب کو جا کر جگا دے۔" [۲۱]

"اب اس بسمتیا کی بچی کو کیسے سمجھاؤں کہ جمعہ کا روز ہے۔ زوال کا وقت۔ اور چلی
ہے بی جھاڑو دینے۔۔۔ صبح ہی صبح بلی کے بچے پر پتھر پھینک رہا تھا۔ اب بلی دودھ
پی جاتی ہے تو پی جائے بھلا جمعہ کے روز پتھر مارنے سے اس کے گھر کے مقدر
پھوٹیں گے کہ نہیں۔ کوئی خیال ہی نہیں جمعہ کا۔" [۲۲]

یہ وہ مکالمات ہیں جو آج بھی ہمارے گھروں کی بڑی بوڑھیوں کی زبانی سننے کو مل جاتے ہیں ذوقی نے پرانے زمانے کے خیالوں کا بخوبی ذکر کیا ہے جس سے نہ صرف ناول کو دلکشی بخشی گئی ہے بلکہ خاص طور پر عورتوں کی سوچ کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔

ذوقی نے ناول کا عنوان اقبال کے مندرجہ ذیل شعر سے لیا ہے۔

"میں کہ، مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو"

ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

حصہ اول: ا _ سراغ سے قبل (۲۰۰۸ء)

ب _ ڈراؤنی رات کے بعد (۲۰۰۸ء)

حصہ دوم: آتشِ رفتہ کا سراغ (۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک)

حصہ سوم: آب رواں کبیر (۲۰۱۰ء سے مسلسل)

پہلے حصے کی ابتدا میں وہ اقبال کے مندرجہ ذیل شعر کو اضافہ کرتے ہیں۔

" آگ بجھی ہوئی ادھر،ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں "

حسبِ معمول ناول کے تیسرے اور آخری حصے کی شروعات بھی وہ اقبال کے شعر سے کرتے ہیں۔

" آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب "

ناول کے پلاٹ کی تشکیل کے حوالے سے ذوقی نے کچھ پیچیدگی کا سہارا لیا ہے ان کا پلاٹ مرکب پلاٹ ہے مگر انہوں نے جس کمال مہارت سے ناول کی مرکزی کہانی کے ساتھ دیگر ضمنی کہانیوں کو جذب کیا ہے تو وہ پلاٹ کو معیاری پلاٹ میں تبدیل کر دیتا ہے جو ناول نگار کی سب سے بڑی خوبی مانی جاتی ہے اور اسی کی بدولت قاری کی دلچسپی ناول کے آغاز سے اختتام تک قائم رہتی ہے۔

ناول کا پلاٹ ایک عام ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔

پہلے باب کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں ایک مسلمان گھرانے کے ذریعے ہندوستان میں موجود مسلمانوں کی حالتِ زار کی عکاسی کی گئی ہے۔

جبکہ دوسرے حصے میں بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے پیچھے جو سازشیں چلی گئی ہیں ان کو بیان کیا گیا ہے اس حصے کا آغاز ذوقی نے ناول کے راوی ارشد پاشا کی زبانی کیا ہے جو اپنے بچپن، تقسیم کے واقعات اور کاشی کی گلیوں میں گزری گزشتہ زندگی کو اپنی زبانی قاری تک پہنچاتا ہے۔

دوسرے باب میں بابری مسجد کے فیصلے کے پیچھے چلی جانے والی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور ناول کے پسِ منظر میں چلنے والی اصل کہانی جو اسامہ نام کے کردار کی تلاش کے گرد گھومتی ہے وہ آخری دونوں حصوں پر چھائی رہتی ہے جس کی وجہ سے ناول طوالت کا شکار بھی ہو گیا ہے۔

ذوقی نے ناول کے تمام حصوں کو باقاعدہ مہینوں اور سالوں کا حوالہ دے کر آگے بڑھایا ہے جس وجہ سے ناول کی طوالت بھی قاری کے لیے مشکلات کا سبب نہیں بنتی اور قاری کڑی سے کڑی ملاتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے " آتشِ رفتہ کا سراغ " بیانیہ تکنیک میں لکھا گیا ہے جس کا راوی ارشد پاشا خود اس ناول میں ایک مضبوط کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔

درمیان میں فلیش بیک کی تکنیک کا بھی سہارا لیا گیا ہے جبکہ راوی اپنے ماضی کا بیان بھی کرتا ہے، ذوقی نے تسلسل کو

قائم رکھنے کی پوری کوشش کی ہے بیانیہ اور فلیش بیک دونوں تکنیک ناول میں موثر ثابت ہوئی ہیں۔
ناول کے عقبی صفحے پر جہاں مشرف عالم کی تصویر عیاں ہے وہیں یونس خان کی سطور بھی درج ہیں جس کے مطالعے سے ناول کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ملاحظہ کریں۔

"میں نے ابھی ابھی اس ناول کو ختم کیا ہے اور میں ابھی بھی اسکے سحر میں گم ہوں
یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ناول کے سحر سے کب باہر نکل سکوں گا اس ناول کو لکھنا
آسان نہیں تھا، پاکستان میں ہم ایسے ناولوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے مجھے نہیں
خبر کہ آپ کو اس کے لکھنے کا حوصلہ کہاں سے ملا۔"

کردار نگاری کو ناول کی روح کا درجہ حاصل ہے ناول کا پلاٹ کرداروں سے ہی تشکیل پاتا ہے کردار حقیقی دنیا میں موجود انسانوں کا عکس ہونے کے ناطے کہانی کو حقیقی رنگ دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔
زیر بحث ناول میں کرداروں کی ایک خاص تعداد دیکھنے میں آتی ہے جو اپنی انفرادی اہمیت کے حامل ہیں جن کے مطالعے سے ہندوستانی مسلمانوں کی بےبسی اور بے چارگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
اس ناول میں ذوقی قاری کو قدم قدم پر چونکاتے ہوئے نظر آتے ہیں، زندگی کے گمنام گوشوں اور حقیقتوں سے ایسے پردہ اٹھاتے ہیں کہ قاری چونکنے پر مجبور ہوجاتا ہے ان کرداروں کے ذریعے ذوقی نے ہندوستان کے سیاسی رنگوں اور ان کے ذریعے سے پیدا ہونے والی سازشوں پر روشنی ڈالی ہے جو ناول کے مطالعے سے سامنے آجاتی ہے۔
ناول کا مرکزی کردار اسامہ ہے، ذوقی نے ایک سولہ سال کے بچے کو اسامہ نام دے کر ناول کی کڑیاں اس کے گرد بنی ہیں، ایک طرف پوری دنیا میں اسامہ بن لادن کا خوف سمایا ہوتا ہے تو دوسری طرف اسامہ نام کا ایک معصوم کردار اپنے نام سے الجھ رہا ہوتا ہے وہ سکول جانے سے کتراتا ہے کیونکہ اس کے سکول کے ساتھی اسے اسامہ بن لادن کہہ کر چڑھایا کرتے تھے، اس کا مذاق اڑایا کرتے۔
بالآخر وہ راستہ تبدیل کرتا ہے وہ جو کتنے مولوی بدلنے پر بھی قرآن پاک ناظرہ میں بھی نہیں پڑھ پایا تھا، اس نے نماز پڑھنی شروع کردی، اپنا حلیہ تبدیل کرلیا یہاں تک کہ اپنے کمرے میں بھی وہ تمام چیزیں جو اس کا شوق ہوا کرتی تھیں نکال کر ان کی جگہ اسلامی کتابوں اور کیلنڈروں کو دے دی۔ اسامہ کا کردار ناول میں کم منظر عام پر آتا ہے مگر یہ پورا ناول ہی اس کے گرد گھومتا ہے ابتدائی باب میں اس کی شخصیت اور خیالات سامنے آتے ہیں مگر درمیان میں ناول صرف اس کے تذکرے سے آگے بڑھتا ہے، تیسرے باب میں پھر سے اسامہ پاشا کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس کے سفر کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے کہ ایک سولہ سترہ سال کا مسلمان لڑکا جو اس سسٹم کے ہاتھوں مجبور ہوکر گھر سے بھاگ

کھڑا ہوتا ہے ایک نا کردہ جرم کی سزا میں وہ اپنے پیارے دوستوں کی موت کا منظر دیکھتا ہے، اسے اس بے رحم سسٹم سے نفرت ہوتی ہے، جس معاشرے میں اس کا مسلمان کہلانا اس کی سب سے بڑی غلطی تصور کی جائے اسی معاشرے میں وہ ہندوؤں کے قریب ہوتا ہے، اپنی کمسنی میں ہی وہ بڑے بڑے نانترک کو بھی یہ کہہ دینے پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ کسی بڑے مقصد کے تحت سفر پر نکلا ہے اور یہ بھی نہیں کہ اس نے اپنی شناخت چھپائی، ہر نئی جگہ پر وہ اپنے نام کی جگہ اپنے بے گناہ دوستوں کے ناموں کا استعمال کرتا مگر ہر جگہ وہ ایک سچے اور مذہبی مسلمان کے روپ میں سامنے آیا جو مندر میں بھی نماز پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

"عام بچہ نہیں ہے۔ بھگوان نے کسی بڑے کاریہ کے لیے بھیجا ہے اسے۔ ایک مسلمان بچہ اس طرح ہم سادھو سنیاسوں کا دل جیت لے۔ اسمجھو۔ وہ بھی اپنے دھرم کا پالن کرتے ہوئے۔" [۲۳]

یہ ایک خوبصورت ذہن اور دل کی سچی تصویر ہے جسے ذوقی نے اپنے ناول کا حصہ بنا کر متن میں ایک اچھا اضافہ کیا ہے ایک اور بات قابل غور ہے کہ اس کردار کے لیے ذوقی نے ایسا نام منتخب کیا جس کی دہشت سے دنیا کا سپر پاور ملک امریکہ بھی کانپتا تھا مگر ذوقی نے یہاں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایک اسامہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، ایک شخص کے حوالے پر تمام مسلمانوں کو دہشت گرد نہیں لکھا جا سکتا۔

مجموعی طور پر اگر جائزہ لیا جائے تو اسامہ ایک جاندار کردار ہے جو اپنے اندر کی اچھائی کے بلبوتے پر تمام مذاہب میں محبت کو کھوجنے نکلتا ہے اور اس کا سفر ناول کے اختتام پر بھی مکمل نہیں ہوتا بلکہ وہ گردشِ سفر میں رہتا ہے۔

دوسرا اہم کردار ارشد پاشا کا ہے جو کہانی کا راوی ہونے کے ناطے پورے ناول میں نظر آتا ہے۔

یہ کردار ایک ایسے شخص کا ہے جو اپنے بیٹے کے مستقبل کو لے کر فکرمند ہوتا ہے جب وہ سنتا ہے کہ اس کے بیٹے کے نام کو لے کر مذاق بنایا جاتا ہے مگر اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ جن ابتدائی اشاروں سے وہ پریشان ہو جاتے ہیں بعد میں وہ بڑی تکالیف کا موجب بننے والے ہیں ناول کے ابتدائی اوراق میں وہ مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"شیکسپیئر نے کہا تھا، نام میں کیا رکھا ہے۔ لیکن یہاں پر یہ نام میرے بیٹے کی پریشانیوں کا باعث بن گیا تھا۔۔۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایک دن یہ نام وقت کے زنبیل سے ایک نئے چہرے کو برآمد کر لے گا۔ ایک ایسے نئے چہرے کو جسے میں پہچان بھی نہیں پاؤں گا۔" [۲۴]

ارشد پاشا ایک ایسا کردار ہے جس نے کبھی نماز، روزے کی طرف رجوع نہیں کیا تھا مگر مشکل پڑتے ہی اس کے اندر کا مسلمان باہر آجاتا ہے، بیٹے کے گم ہوتے ہی وہ نمازی بن جاتا ہے اور اس کا خدا پر یقین مزید پختہ ہو جاتا ہے اس حوالے سے وہ اپنی بیوی سے جو مکالمہ کرتا ہے قابلِ غور ہے ملاحظہ کریں۔

"اللہ کو مانتی ہونا۔ بھروسہ کرتی ہونا۔ تو بھروسہ کرو۔ وہ راستے بناتا ہے۔ معصوم
کیڑے مکوڑوں کو رزق پہنچاتا ہے، وہی میرے بیٹے کو بھی رزق پہنچائے گا۔" [۴۵]

ناول کے درمیان میں یہ کردار ماضی میں کھو جاتا ہے جہاں وہ کاشی کی گلیوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا ہے ایک انقلابی نوجوان کی صورت میں اس کا بھائی انور پاشا بھی ان صفحات میں چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

ارشد پاشا کے کردار کے ذریعے ذوقی نے مسلمانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان آخر کب تک ظلم وستم برداشت کریں گے اور بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزارتے رہیں گے۔

ایک ہندو کردار تھاپڑ سنگھ جو کہ راوی ارشد پاشا کا گہرا دوست ہوتا ہے تھاپڑ سنگھ، ارشد پاشا کے ساتھ جوانی سے ہی ساتھ تھا، ہر مشکل میں وہ ارشد پاشا کا ساتھ دیتا ہوا اور قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوا نظر آتا ہے۔

بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کے وقت وہ اسامہ کو اپنے گھر قیام کرواتا ہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور اسامہ کی جان بچ جائے۔

ناول کے تیسرے باب میں ارشد پاشا کے سامنے تھاپڑ کا بھید کھولتا ہے جس نے اس کے تمام نظریات ہی بدل کر رکھ دیئے، ذوقی نے اس کڑوے سچ کو تمام ہندوستانی مسلمانوں تک پہنچانا چاہا جس کے لیے انہوں نے اس کردار کا سہارا لیا۔

ارشد پاشا کے نزدیک تھاپڑ ہندو مسلم میں علیحدگی پر یقین نہیں رکھتا تھا یہاں تک کہ وہ مذہب پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا مگر وہ ایک دم سے ایک مذہبی جنونی کے طور پر سامنے آتا ہے تو ارشد پاشا اپنی آنکھوں کے دیکھے اور کانوں کے سنے پر بمشکل یقین کر پاتا ہے۔

تھاپڑ درحقیقت سنگھ (ایک ہندو جنونی تنظیم جو ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف کام کرتی ہے) کا آدمی ہوتا ہے۔ جس کے دل میں مسلمانوں کے لیے شدید نفرت اور بدلے کی آگ جل رہی ہوتی ہے جو اس کے پرکھوں نے اس کے ہندو خون میں ڈال دی تھی اس کے خیالات اس کی زبانی ملاحظہ کریں۔

"ہم شانتی سے رہنے والے لوگ تھے۔ یہ ہماری زمین تھی۔ آریہ درت۔ اور یہاں تم
نے اپنے ناپاک پاؤں پھیلا دیئے۔ ۷۰۰ برسوں کی غلامی ہمارے نام لکھ دی۔۔۔
ہم بھارت کو ایک جمہوری مملکت کے بجائے ایک ہندو راشٹر یہ بنانا چاہتے ہیں تاکہ

ایک ایسا ہندو ملک جہاں صرف ہماری حکومت ہو۔" [۲۶]

ناول میں مختلف مزاج کے کردار نظر آتے ہیں ایک اگر ہندوستان میں مسلمانوں سے ہونے والی زیادتیوں پر دکھی نظر آتا ہے تو دوسرا کردار پاکستان کی طرف ہجرت کرنے میں ہی تمام مسلمانوں کی آفیت سمجھتا ہے، پرکھوں کی امانتوں کے محافظ جو باپ دادا کی قبروں کو چھوڑ کے جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے انہی کرداروں کے امتزاج سے ناول میں اچھی تبدیلی نظر آتی ہے۔

ناول کے مرکزی کردار ارشد پاشا سے اکثر کردار جڑے ہوئے ہیں وہ اس کی بیوی رباب ہو، ماں ہو کہ والد اور بھائی بہن مگر اس کے علاوہ ایک اور کہانی بھی قاری کی دلچسپی کا باعث بنتی ہے جو ایک آزاد خیال لڑکی صوفیہ احمد کی ہے جو ارشد پاشا سے محبت کرتی ہے مگر وہ محبت اس کو نہیں ملتی تو وہ اپنے والد کا اخبار چلاتے ہوئے اپنے آزادانہ خیالات کو فروغ دیتے دیتے سیاست کا حصہ بن جاتی ہے اور ایک کامیاب ورکر کے طور پر جانی جاتی ہے۔

ذوقی کے کرداروں کو دیکھا جائے تو وہ اپنے ماحول سے اجنبی نہیں لگتے بلکہ وہ کہانی سے میل کھا رہے ہوتے ہیں۔ نسوانی کرداروں میں ایک کردار مضبوط نظر آتا ہے اور وہ رباب کا۔

یہ کردار ایک طرف تو بیٹے کی جدائی میں آنسو بہاتی ہوئی نظر آتی ہے مگر دوسری طرف وہ خود کو مضبوط بھی ظاہر کرتی ہے، بیٹے کے غم سے نکلنے کے لئے وہ ایک بے آسرا لڑکی کو بیٹی بنا کر گھر لے جاتی ہے جس سے اس کا دھیان کچھ بٹ جاتا ہے مگر وہ بیٹے کی جدائی میں شعر لکھتی ہوئی بھی نظر آتی ہے، نماز پڑھی ہوئی نظر آتی ہے اور سب سے خاص بات جو اس کردار کی قابلِ ذکر ہے وہ اس کی مضبوطی ہے وہ ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتی ہے اور پولیس کی دھمکیوں کو آڑے نہیں لاتی، آخر میں اسی امید کے ساتھ زندگی گزارنے لگتی ہے کہ اس کا بیٹا لوٹ آئے گا۔

ذوقی کے نسوانی کردار ہمیشہ سے ہی مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں زیرِ بحث ناول کے تمام کردار ہی انفرادیت کے حامل ہیں ذوقی نے ان کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی بے بسی اور لاچاری کو سب کے سامنے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے، یہ کردار ہندوستان کی سیاسی زندگی کے پیچھے چھپی ہوئی سازشوں کو عیاں کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

زیرِ بحث ناول میں مرقع نگاری کے نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں ذوقی نے اس مہارت سے کرداروں کے مرقعے بیان کئے ہیں کہ کردار خود چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس حوالے سے ان کی مہارت قابلِ تعریف ہے کہ انہوں نے کرداروں کو ان کے اصل روپ میں پینٹ کیا ہے۔

مرقع نگاری کے چند نمونے ملاحظہ کریں۔

"دبلے، پتلے، ماتھے پر ٹیکا لگائے، دھوتی اور کرتا پائجامہ پہنے ہری بھائی کے
ہاتھوں میں کچھ دن پرانا ہندی کا اخبار تھا جس میں اسامہ کی تصویر چھپی
تھی۔" [۲۷]

"دبلا پتلا جسم۔ قد لگ بھگ چھ فٹ... سخت انگلیاں ... تجربہ کار آنکھیں۔
آنکھوں پر جھولتی ہوئی موٹے شیشے والی عینک۔۔۔" [۲۸]

"وہ خاندانی امام تھے، آنکھوں پر کالا چشمہ ... کافی بڑا منہ... میانا قد...
کان کافی بڑے... سر پر سفید ٹوپی... چوڑے اتنے کے پانچ صحت مند
جوان شامل ہو جائیں تو ایک مولوی پشاوری کی برابری نہ کرسکیں۔" [۲۹]

ذوقی نے تمام کرداروں کو ان کے حلیے کے ذریعے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

ذوقی کے تمام ناولوں میں منظر نگاری نظر آتی ہے انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے رہن سہن، طہوار، شادی بیاہ کی رسموں سے واقفیت رکھتے ہیں جس کے سبب انہیں اس سے متعلق مناظر کو الفاظ کا روپ دینے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

زیرِ نظر ناول میں محرم الحرام کے جلوسوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ان تمام مناظر کی ایسے عکاسی کی ہے کہ منظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

"امام باڑے میں ہلچل تھی، نیاز فاتحہ ہو رہی تھی، ایک طرف محلے کے چھوکرے
بچے۔۔۔ڈھول ڈرم پیٹے جا رہے تھے۔۔۔امام باڑے کے ایک طرف لئی
گوندا اور رنگ برنگی چمکیاں لیے محلے کے لڑکے جالیاں جھالریں بناتے اور اسے
تعزیہ میں سجانے کی تیاری کر رہے تھے۔" [۳۰]

ذوقی کا شمار حقیقت پسند ناول نگاروں میں ہوتا ہے ان کے تمام ناولوں کے فضاء حقیقت پر مبنی قائم کی گئی ہے ان کے ناول رومانوی کہانیوں سے کوسوں دور ہیں جب وہ کسی شہر یا محلے کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ انہی مناظر کو قلمبند کریں جو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں ان کے کسی بھی ناول میں خیالی دنیا نہیں نظر آتی، زیرِ نظر ناول میں بھی جب وہ کاشی کے گلی محلوں کا ذکر کرتے ہیں تو ویسے رنگ میں ہی بیان کرتے ہیں جیسے وہ دیکھ چکے ہوتے ہیں۔

کاشی کے مناظر کو جس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ملاحظہ کریں۔

"بازاروں میں دھوم، بنارسی پان اور بنارسی ساڑھی، پیتل اور اسٹیل کے برتن،

مٹھائیوں کی دکانیں، حکیم اور عطار کی دکانیں۔۔۔رادھارمن جی کا مندر اور
بھی آس پاس کتنے ہی مندر۔مندروں اور گھاٹوں کی نگری ہے یہ کاشی۔" [۳۱]

ذوقی منظر نگاری میں جذیات نگاری کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔

"وہ ایک بڑا سا حال تھا۔کئی صوفے لگے تھے۔دیوار پر بڑی بڑی پینٹنگز اس بات
کی گواہی دے رہی تھیں کہ صاحب خانہ کو مصوری سے عشق ہے۔۔۔ہال میں چار
پانچ سو کمپیوٹر لگے تھے، جن پر ابھی بھی بیٹھے ہوئے لوگ کچھ سرچ کرنے میں
مصروف تھے۔۔۔" [۳۲]

ذوقی نے ایک جگہ اتنی مہارت سے منظر نگاری کی ہے کہ ناول کے کردار کی بھی تصویر کشی ہو گئی ہے۔

" کمرے میں کتابوں کی ایک میز تھی۔دوسری میز پر ایک کمپیوٹر تھا۔مگر اب
دیواروں پر مذہبی کلینڈر آویزاں تھے۔کمپیوٹر والی میز پر ایک دو پلی
ٹوپی بھی پڑی تھی۔" [۳۳]

ان الفاظ کے مطالعے سے نہ صرف کمرے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے بلکہ اس کمرے سے متعلق کردار کی بھی عکاسی ہو جاتی ہے۔

ذوقی نے منظر نگاری کے فرائض کو بڑی خوبصورتی سے انجام دیا ہے، انہوں نے تمام مناظر کو اس کی حقیقی رنگوں میں پیش کیا ہے تمام مناظر کو بیان کرنے میں انہوں نے صداقت کا سہارا لیا ہے چاہے وہ مناظر کسی بازار کے ہوں، گلی محلے کے یا پھر کسی سیاسی واقعہ کے۔

ذوقی مناظر کی ہو بہو عکاسی کرنے میں قابلِ تعریف ہیں اور ان کا انداز بیان قابلِ قدر ہے۔

منظر نگاری کی طرح اس ناول میں مکالمہ نگاری بھی عروج پر ہے ناول کے مطالعے سے اس میں موجود مکالموں کے ذریعے ایک طرف تو ماں باپ کا اپنی اولاد کے لیے فکر مند ہونا نظر آتا ہے تو دوسری طرف بے خوف مکالمات بھی قاری کی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔

مسلمان کرداروں کی زبان سے جو مکالمے ادا ہوئے ہیں وہ خالص اردو میں ہیں جبکہ ہندو کرداروں کے ہندی مکالموں کے مطالعے سے ناول کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں مشکل نہیں پیش آتی، اس کی مثال دیکھنے کے لیے ناول میں سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"دھارا۸۱ کے مطابق بھگوڑے شخص کی سمپتی کی قرقی کی جا سکتی ہے۔اس میں آگے
یہ بھی جوڑا گیا کہ جو شخص مفرور ہے اس کے خلاف مقدمہ کی سنوائی اس کی غیر موجودگی

میں بھی ہوسکتی ہے۔۔۔" [۳۴]

ہندوستانی پولیس مسلمانوں کے ساتھ جیسا رویہ روا رکھتی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ وہ جس طرح کی زبان استعمال کرتے ہیں ذوقی نے انہی کی زبانی ناول میں شامل کردی ہے جس کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ذوقی نے جو مشاہدہ کیا اس کو الفاظ کا رنگ دے دیا۔

"اب آگئے نا اپنی اوقات پر۔ تم سب سالے اتنگ وادی ہو۔ ہندوستان میں رہ کر پاکستان بنانے کے خواب دیکھتے ہو۔ وہ زور سے چیخا۔ تیرا آتنگ وادی بیٹا کہاں ہے رے؟" [۳۵]

"ہم کمینگی پر اتر آئے ملاّ جی تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تمہارے کھوئے ہوئے بیٹے کو مفرور آتنگ وادی ثابت کرنے میں ہمیں دو سیکنڈ نہیں لگے گا۔۔۔" [۳۶]

"دو منٹ نہیں لگیں گے تم سب کو تڑی پار کرنے میں۔ تم سب کو آتنگ وادی گھوشت کرنے میں۔ مع ثبوت۔۔۔ سالے۔ مغلوں کے زمانے کی اکڑ دکھاتے ہو۔" [۳۷]

ناول کے دو کرداروں ارشد پاشا اور تھاپڑ کے درمیان ہونے والے طویل مکالمات کہیں کہیں قاری کے لیے بیزاری پیدا کردیتے ہیں مگر ذوقی نے ان مکالمات کو بھی دلچسپ بنانے کی پوری کوشش کی ہے چونکہ سیاسی موضوعات پر کی جانے والی گفتگو ہمیشہ ہی ماحول کو ناخوشگوار تاثر دیتی ہے، ذوقی نے کمال مہارت سے مکالموں کو سینچا ہے جس سے طوالت بھی قاری کے لئے دیرپا بےزاری نہیں ثابت ہوتی۔

مختلف کرداروں کے امتزاج سے جو مکالمے ناول میں شامل کیے گئے ہیں وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، ناول کی ضرورت کے پیشِ نظر کرداروں کی زبان سے جذباتی مکالمہ بھی بیان کیے ہیں۔

"اب تم اور کہو گے بھی کیا، سٹھیانی بلی کھمبا نوچے۔ میاں جان لو۔ اسلام ہمیشہ حق کی آواز پر پھیلتا ہے۔ یہ ہمارے نصاب کا جھوٹ ہے جو بچپن سے تمہیں گھول گھول کر پلاتا جاتا رہا ہے کہ مسلمان بادشاہ ایسے رہے ویسے رہے۔ تلوار کے زور پر اسلام کو پھیلایا۔۔۔" [۳۸]

مذہبی تقاریر میں خاص طور پر جذبات اُمڈ آتے ہیں ذوقی نے مذہبی تقاریر کے دوران نعرہ بازی کو اسلوب کا حصہ بنایا ہے جو ان کی فکر کو نثری اور شعری سرمائے میں منتقل کرنے کا خاص فن ہے۔

"ان کی لرزتی، کانپتی ہوئی آواز جب ہوا کے دوش پر لہراتی تو برادران اسلام میں جوش آجاتا۔ آواز گونجتی۔ زور سے کہو۔ نعرۂ اسلام۔ اللہ ہو اکبر۔۔۔" [۳۹]

کسی بھی ناول کی کامیابی میں اس کے اسلوب، زبان و بیان اور طرز ادا کا خاص عمل دخل ہوتا ہے ذوقی نے اس ناول میں اکثر جگہوں پر منفرد اور اچھوتا اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کی وسیع معلومات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اپنے اسلوب اور منفرد اندازِ بیان کی خوبیوں کی وجہ سے اردو ناول نگاروں کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اگر وہ ناول کی زبان و بیان پر گرفت نہ رکھتے ہوتے تو زیرِ نظر موضوع جیسے نازک موضوعات پر خوش اسلوبی سے نہ لکھ پاتے، ان کی زبان ناول کی روح کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اس لئے ان کے زبان تصنع اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے، ان کا تلخ اور چبھتا ہوا لہجہ قاری کو قدم قدم پر آئینہ دکھاتا رہتا ہے، ذوقی کے عمیق مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی وجہ سے زیرِ نظر ناول کی کہانی تمام ہندوستانی مسلمانوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

ذوقی نے مقامی زبانوں کا استعمال کیا ہے تاکہ قاری کو سمجھنے میں دشواری نہ پیش آئے۔

ذوقی خالص ہندوستانی اور حقیقی ماحول کو ناول کا حصہ بناتے ہیں جن میں ان کا اسلوب بیان سب سے زیادہ معاون ثابت ہوتا ہے، ان کا اسلوب ہر جگہ صاف ہوتا ہے اور قاری کو اکتاہٹ اور کسی طرح کی شکوک میں نہیں ڈالتا۔

مقامی زبانوں کے استعمال کی وجہ سے قاری پر بہت دباؤ نہیں پڑتا اور وہ بار بار لغت کا سہارا لینے سے بھی چھٹکارا پالیا ہے۔

ذوقی اعلیٰ طبقے کے لیے مختلف اور نچلے طبقے کے لیے مختلف زبان کا استعمال کرتے ہیں انہوں نے گاہے بگاہے اشعار کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔

"مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض چکائے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے" [۴۰]
"پلک جھپکتے بڑھاپے میں پاؤں رکھتے ہیں
ہمارے عہد کے بچے جوان نہیں ہوتے" [۴۱]

ایک معصوم گمشدہ بچے کی ماں کے جذبات ذوقی نے شعریت میں جس خوبصورتی سے بیان کئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔

"میرے بچے۔۔۔" [۴۲]

ذوقی نے کرداروں کے ذریعے موقع محل کے مطابق اشعار ادا کروائے ہیں۔

"بڑے میاں کو پتہ نہیں کہاں سے اچانک اورنگزیب کی یاد آ جاتی پھر لہک کر شعر پڑھتے ___
تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگزیب ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا" [۴۳]

ذوقی نے اس ناول میں انقلابیوں اور مذہبی رہنماؤں کی تقاریر کو بھی جگہ دی ہے اور کچھ جگہوں پر وہ تقاریر میں بھی شعریت کا سہارا لیتے ہیں جو ان کی فکر کو شعری سرمائے میں منتقل کر دیتی ہے۔

"ابھی بھی سوئے رہے گر تو خود کو کھو دوگے

ابھی بھی اپنی جبینوں میں تیس پاروں کی

وہ حق صدا تو کہیں بھی دکھائی دیتی نہیں۔۔۔" [۴۴]

" آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب " [۴۵]

ذوقی ناول کے اسلوب میں بیشتر جگہوں پر انگریزی معنی خیز الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے جس سے اسلوب میں ایک نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

"No more batla house

we are not terroriat." [۴۶]

کاشی کے رسم ورواج جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ منہدم ہوتے گئے ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ان کو بھی اجاگر کرکے پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر بھانڈ جس طرح کے گیت گایا کرتے تھے اس کی مثال ملاحظہ کریں۔

"اے پیا بجارج ءیو۔ واہ واہ جی واہ واہ جی

لمبے لمبے سیر اوڑال ءیو۔ واہ واہ جی واہ واہ جی

گرم گرم جلیبی یو۔ واہ واہ جی واہ واہ جی۔۔۔" [۴۷]

ذوقی نے صاف اور سادہ مقامی زبان کا استعمال کیا ہے جس سے ان کی تحریروں میں مقناطیسی کشش دیکھنے کو ملتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ ناول " آتشِ رفتہ کا سراغ " اپنے موضوع اور فکر کے لحاظ سے کامیاب ترین ناول ہے۔

نالۂ شب گیر

"نالۂ شبِ گیر" کوعورتوں کی داستان کہہ سکتے ہیں ایسی عورتوں کی روداد جوصدیوں سے اس مردسماج میں ظلم سہہ رہی ہیں، ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ایک نئی فکر کوروشناس کروایا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے اپنے ہرناول میں اچھوتے موضوعات کوہی اپنایا ہے، انہوں نے ہمیشہ اورفکشن نگاروں کی نسبت مختلف موضوعات کوزیرِ بحث لاکراپنا الگ مقام بنایا ہے، زیرِنظرناول عورتوں کے مسائل پرایک دلچسپ ناول ہے ناول کا انتساب ملاحظہ کریں جس میں ذوقی کی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس ناول کے پسِ منظر میں کون سے خیالات ان کوگھیرے ہوئے تھے۔

"ہراس لڑکی کے نام جو باغی ہے اوراپنی شرطوں پرزندہ رہنا چاہتی ہے"۔

اردوادب میں عورت کولے کر بہت کچھ لکھا گیا۔منٹو،عصمت چغتائی،خدیجہ مستور،رشید جہاں،واجدہ تبسم،ممتاز شیریں،کشورناہید،رضیہ سجاد،سجادظہیراور جیلانی بانو جیسے بڑے ناموں نے عورت کے دردوکرب،اس کی کمزوریوں اوراس کی مردسماج کے خلاف بغاوت پر بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سلسلہ رکانہیں بلکہ جاری ہے مگران مصنفین نے جن عورتوں کے کرداروں کو بیان کیا وہ" نالۂ شبِ گیر" سے مختلف ہیں ذوقی نے اس گلوبلائزیشن کے دور میں عورت کومرد سے ہرمیدان میں، ہرمقابلے میں ایک سخت چٹان کی صورت میں پیش کیا ہے۔اس ناول میں عورت کا ایک نیا چہرہ دیکھنے کوملتا ہے ایسی عورت جومردسماج کے خلاف اٹھ کھڑی ہے، وہ تمام رکاوٹوں اور بندھنوں کوتوڑکراپنی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کوپھلانگ کرمقابلہ کے لئے تیار ہوتی ہے ذوقی نے زیرِنظرناول میں ایسی عورت کا نالۂ شبِ گیر بیان کیا ہے۔ناول کے ابتدائی صفحات میں ذوقی علامتی اندازِتحریراپناتے ہیں جس میں وہ ان حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جوآدم کی پیدائش کے بعد حواکواسی کےبطن سے پیدا کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جواس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ آدم کی پیدائش پرحواکوبھی پیدا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مرداورعورت دونوں کا وجود ایک دوسرے کیلئے لازم وملزم ہے مگرصدیوں سے مردعورت پرحاوی رہے ہیں۔ذوقی کے اس ناول کے شائع ہونے سے پہلے ہی کافی کامیابی حاصل کرلی تھی کیونکہ ذوقی نے جس حساس موضوع پرقلم اٹھایا،اس پران کی تعریف لازم ہے ناول کے بارے میں اکثرلوگوں نے اپنی اپنی آراءدی ہیں اورناول کے اختتامیہ میں ہی کچھ قدردانوں کے تاثرات کوذوقی نے ناول کا حصہ بنایا ہے۔

پاکستان کی شاعرہ اورفکشن پرگہری نظر رکھنے والی نایاب حسن نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس ناول پرتاثرات دیے

ملاحظہ کریں۔

"غیر معمولی اور زبردست فکر۔عورت کے موضوع پر ایسا ناول اردو میں بھی آئے گا یہ سوچ سے پرے ہے۔آج کی بدلتی ہوئی دنیا میں ہر لحظہ ایک نئی کہانی کا جنم ہو رہا ہے۔۔۔نالۂ شبِ گیر جسموں کی کہانی ہے۔غالب آتے ہوئے جسموں کی کہانی۔۔۔۔"

ذوقی نے اس ناول کو خوبصورت مہارت کے ساتھ سینچا ہے جس وجہ سے یہ ناول کم اور عورتوں کی سچی روداد زیادہ معلول ہوتی ہے۔ذوقی نے اس ناول کے ذریعے سے عورتوں کی نفسیاتی الجھنوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، ناول کے اندازِ بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس ناول کے خیال کو سالوں سے اپنے اندر بسایا ہوا تھا کیونکہ ایسا کرشمہ سالوں کی مسلسل تلاش اور غور و فکر کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔انہوں نے women Empowerment پر اتنا جاندار ناول لکھ کر اردو ناول کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ کیا ہے اس ناول کو لکھنے کے پیچھے ان کی ایک ہی فکر کارفرما تھی کہ وہ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسی جانے والی عورتوں کو بااختیار دیکھنا چاہتے تھے آج پوری دنیا میں عورتوں کے حقوق کی آواز اٹھائی جا رہی ہے ہر جگہ عورتوں کے استحصال پر بات کی جا رہی ہے ذوقی نے بھی اس ناول کے ذریعے عورتوں پر بات کی ہے اور خاص طور پر مسلمان عورتوں پر جو پیدا ہوتے ہی چار دیواری اور برقعہ کی قید میں جکڑ دی جاتی ہیں، جہاں شادی بیاہ جیسے بڑے فیصلے بھی ان کی مرضی کے بغیر کر دیے جاتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی اسی معاشرے میں رہنے کے سبب تمام حقائق سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو کس طرح کے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور کس گھٹن زدہ ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے جہاں لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے مختلف قاعدے اور قانون بنائے گئے ہیں، جہاں مرد آزاد اور عورت قید میں ہے، مرد تمام عمر خاندان کی عزت و ناموس کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہیں جبکہ عورت تمام عمر جہنم جیسی آگ میں جلنا پسند کرتی ہیں پر خاندان کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتی ذوقی نے اس دوغلے پن پر سے پردہ ہٹایا ہے۔ذوقی نے اس ناول میں جونا گڑھ کی مسلم آبادی کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور اس کے پسِ منظر میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب بھی بیان کیے ہیں، انہوں نے بہت کھلے ڈھلے الفاظ میں ان نام نہاد عزت داروں کا پردہ چاک کیا ہے جو جنسی کھیل کے اس قدر شیدائی ہوتے ہیں کہ گھر کی معصوم بچیاں بھی انکی شیطانیت سے محفوظ نہیں رہ پاتیں۔برصغیر کے مسلمانوں پر نظر دوڑائی جائے تو تاریخ گواہ ہے اس بات کی کہ اپنی جنسی تسکین کی خاطر یہ نام نہاد عزت دار لوگ طوائفوں کے کوٹھوں پر پائے جاتے تھے، گھر کی عورت ان کے نزدیک صرف نسل بڑھانے کے لئے آلہ کار کا درجہ رکھتی اور اس سے زیادہ

اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی ایسے میں اس گھٹن زدہ ماحول میں عورت ایک کنیز یا نوکرانی سے زیادہ کا درجہ نہیں رکھتی تھی، تقسیم کے بعد کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے جاگیردارانہ نظام کے اختتام پذیر ہونے کے بعد بھی عورت کے لئے آزادی کی راہیں ہموار نہیں ہوئیں بلکہ گھٹن زدہ ماحول میں وہ صرف جنسی تسکین کیلئے استعمال کی جاتی رہی۔ذوقی نے اس ناول میں جونا گڑھ کے ایک ایسے ہی مسلمان گھرانے کی روداد بیان کی ہے جہاں عورتوں کو زبردستی اپنے روزمرہ کے جنسی کھیل میں گھسیٹ لیا جاتا تھا انہوں نے اس پورے کھیل کو مکمل طور پر ناول میں بیان کیا ہے جس کے لیے انہیں بہت زیادہ ہمت درکار تھیں مگر انہوں نے بے باکی سے عورت کے حق میں آواز اٹھائی ہے،عورت پر جتنا بھی لکھا گیا وہاں عورت مظلوم ہی نظر آتی ہے روتی دھوتی،ظلم سہتی مگر ذوقی نے ایک نئی طرز اپنائی انہوں نے عورت کو ایک نئے روپ میں پیش کیا ہے آج کی عورت میں اور اس کمزور عورت میں زمین آسمان کا فرق ہے، آج کی عورت اپنے حق کے لیے لڑنا جانتی ہے، آج کی عورت خوفزدہ نہیں ہے بلکہ یہ محبت کی دیوی اب نفرت کی دیوی بن چکی ہے ذوقی نے اس مرداساس معاشرے سے عورت پر ازل سے اب تک ہونے والے مظالم کا جواب مانگا ہے۔مشرف عالم ذوقی ایک فرض شناس فنکار ہیں انہوں نے اس ناول میں عورت کی تیزی سے تبدیل ہوتی دنیا کی گواہی پیش کی ہے اور ساتھ میں اس ناول کے ذریعے اس کی عکاسی بھی کردی ہے اس حوالے سے یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ ذوقی نے اس ناول کی بنیاد محض تصورات پر رکھی ہے یا حقیقت میں بھی ایسی عورت پیدا ہو چکی ہے؟ مگر اس بحث سے الگ یہ حقیقت ہے کہ آج کی جدید عورت کو اب مرد ذات سے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ ہی وہ اس کی محتاج ہے کیونکہ عورت نے زندگی سے وابستہ ہر شعبے میں مضبوطی کے ساتھ قدم رکھ دیے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ مسلسل کامیاب ہو رہی ہے۔مصنف نے ناول کو باقاعدہ شروع کرنے سے پہلے ابتدائیہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے نہ صرف ان کے خیالات کی وضاحت ہوتی ہے کہ کس سوچ کے تحت انہوں نے یہ ناول ترتیب دیا بلکہ اس میں وہ عصرِ حاضر کی عورت پر بھی تفصیلی بحث کرتے ہیں اور وہ خود عورت کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی وضاحت بھی ان کے خیالات کے مطالعے سے ہو جاتی ہے، وہ عورت کو جس انداز میں دیکھتے ہیں ان کے خیالات مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعہ سے سمجھے جاسکتے ہیں۔

"میرے ساتھ مشکل یہی ہے کہ میں عورت کے لیے ہمدردی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔۔۔
میں عورت کو صرف مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔۔۔وہ ایک نہ ختم ہونے والا اسرار ہے
اس کی خوبصورتی آپ الفاظ میں قید نہیں کرسکتے۔۔۔" [۴۸]

سیمون دبوار نے اپنی کتاب میں کہا تھا کہ

"عورتیں پیدا نہیں ہوتیں بلکہ بنائی جاتی ہیں۔ وہ ہر بار نئے مردانہ سماج
میں نئے نئے طریقے سے 'ایجاد' کی جاتی رہی ہیں۔"

ذوقی نے اپنے اس ناول میں سیمون دبوار کے اس خیال سے بھی اختلاف کیا ہے اور عورت کو اس کمزور اور بے بس دنیا سے نکال کر ایک نئی دنیا میں پہچان دیا ہے جہاں جدید عورت کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے یہ ۲۰۰۰ء کے بعد کی جدید عورت ہے جو اپنی نئی زندگی کا تعاقب کرتی ہے جو اپنی نئی راہیں خود متعین کرتی ہے جس کے پاؤں میں مذہب اور معاشرے کی بیڑیاں نہیں ہیں، ۲۰۰۰ء ایک نئی صدی کے علاوہ ایک نئے عہد کی شروعات بھی تھی جن پر ذوقی کی گہری نظر ہے ذوقی کے ناولوں میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی جھلکیاں دیکھنے میں آتی ہیں مگر زیرِ نظر ناول میں صرف مستقبل کی پیشن گوئی کی گئی ہے اور اکیسویں صدی کی عورت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس مہذب سماج میں بھی لہولہان ہے۔

ذوقی نے اس ناول میں ۲۰۰۰ء کی نئی دنیا کو بیان کیا ہے جہاں عورت ایک نئی لکیر بن کر ابھری ہے اور مرد ذات اس کے لیے صرف ایک مہرے کی حیثیت رکھتا ہے وہ بغاوت نہیں کر رہی مگر وہ اپنی الگ پہچان بنا رہی ہے جہاں وہ دنیا کو یہ پیغام دیتی ہے کہ وہ مرد ذات کی محتاج نہیں بلکہ وہ اکیلی رہ سکتی ہے، وہ اپنی طاقت سے مرد کی لکیر کو چھوٹا سے چھوٹا کرتی جا رہی ہے یہ ایک نئی دستک ہے جہاں عورت آزادی کی نئی سیڑھیاں چڑھ رہی ہے اب وہ ایک جسم کا درجہ نہیں رکھتی بلکہ وہ اس مہذب سماج میں خود کو طاقت کا ایک نیا استعارہ بنا کر پیش کر رہی ہے ذوقی نے اس ناول کے ذریعے تاریخ کے بدلتے ہوئے دھارے دکھائے ہیں جہاں مرد حاکم ہوا کرتے تھے وہیں اب عورت حاکم ہے، عورت مرد کو گھر سے نکال رہی ہے یہ تبدیلی ہے جو عورت کے استعصال کے خلاف جنگ کی پہلی کامیابی ہے۔

"رات دس بجے بیڈروم کا دروازہ زور سے کھلا_ جیسے زلزلے کا جھٹکا آیا ہو میں نے
دیکھا دروازے پر ناہید تھی_ اس کے ہاتھ میں لوہے کا بڑا سا ڈنڈا تھا۔۔۔ میں
نے کہا تھا نا ... تمہارے ساتھ رہنا مشکل ہے۔ اب حد ہو چکی ہے۔ اب تم اس
گھر میں نہیں رہ سکتے ۔" [۴۹]

صدیوں سے جو مظالم عورت سہتی آ رہی تھی ذوقی نے اب وہ سب عورت کی بجائے مرد پر آزماتے ہوئے دکھائے ہیں، ناول کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہی یہی ہے کہ اس میں عورت بدلہ لیتی ہوئی نظر آتی ہے یہاں وہ حاکم ہے اور مرد محکوم۔

"نالۂ شبِ گیر" اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اور انوکھا ناول ہے یہ کہانی آج کی کہانی نہیں ہے بلکہ ذوقی نے اس ناول کے ذریعے آنے والی صدیوں کی بازگشت سنا دی ہے، ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ایک سچی اور کھری عورت کی داستان بیان کی ہے اور انسانی نفسیات کو اس خوبصورتی سے آشکار کیا ہے کہ فضا میں صدیوں سے موجود دھند ہٹا دی ہے، نئی صدی کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتی ہوئی عورت کو منظر پر لایا گیا ہے ذوقی نے اس ناول میں باور کیا ہے کہ کل کی خوفزدہ عورت کا خوف اب اس کی بغاوت بن چکا ہے انہوں نے عورت کی صدیوں پرانی روایت پر گہرا طنز بھی کیا ہے اور عورت کی آزادی کی نوید بھی سنائی ہے۔

زیرِ بحث ناول کے پسِ منظر میں مرد مخالف تانیثی رویے کا رجحان دیکھنے میں آتا ہے یہ نظریہ دراصل تانیثیت کی ایک جدید شاخ Radical Feminism کے گروپ پر مشتمل ہے جس میں تمام ارکان خواتین ہیں کیونکہ مردوں کو اس میں شمولیت کی اجازت نہیں , اس نظریے کے ماننے والی خواتین اپنی زندگی میں مرد ذات کی دخل اندازی بالکل گوارہ نہیں کرتیں بیشک وہ مرد کا کوئی بھی روپ کیوں نہ ہو، یہ آزاد خیال خواتین کا گروپ ہے جن کے نزدیک وہ اپنے تمام کام خود انجام دینا جانتی ہیں اور کسی مرد کی محتاج نہیں، انہیں کسی مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

اردو ناول میں ان خیالات کو طول دینے میں جہاں مشرف عالم کا یہ ناول قابل غور ہے وہیں ساجدہ زیدی اور شائستہ فاخری کے ہاں بھی یہ مرد مخالفت تانیثی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے جہاں عورت کا استعصال کیا جا رہا ہوتا ہے اور عورت اس پر نہ صرف سراپا احتجاج ہوتی ہے بلکہ وہ اس بات سے بھی صاف طور پر انکاری ہوتی ہے کہ انہیں مرد کے سہارے کی ضرورت نہیں، ذوقی نے بھی اس ناول کے مرکزی کردار کے ذریعے اس موضوع کو زیرِ بحث لانا ضروری سمجھا، زیرِ بحث ناول میں عورت اپنی شرطوں پر زندگی گزرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

"نالۂ شب گیر" کے پسِ منظر میں ذوقی نے دلی گینگ ریپ کو شامل کیا ہے اور اس فکر کو لے کر انہوں نے ناول کو آگے بڑھایا ہے۔

۲۰۱۲ء میں جیوتی سنگھ نامی ایک تیئیس سالہ طالبہ کو چھ افراد نے زیادتی کا نشانہ بنایا، سمبر ۲۰۱۲ء میں بس میں اس پر حملہ کیا گیا جب وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ سفر کر رہی تھی جہاں اسے اجتمائی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا جس میں بس ڈرائیور بھی شامل تھا، جیوتی سنگھ اور اس کے دوست کو بیچ سڑک پر پھینک کر ملزمان فرار ہو گئے بعد از اں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ دم توڑ گئی۔ اس واقعے کے بعد پورے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر احتجاج کیا گیا اور مظاہرے ہوئے، اس واقعے پر نیٹ فلیکس کی طرف سے ڈاکومنٹری بھی بنائی گئی جس نے بھارت میں ایک

ایوارڈ بھی اپنے نام کیا۔

بعدازاں ملزمان کی گرفتاری عمل میں آئی جن میں سے ایک نے خودکشی کر لی اور ایک کم عمر ہونے کی وجہ سے مختصر حراست کے بعد رہا کر دیا جبکہ باقی چاروں کو پھانسی دی گئی، اس واقعے کے بعد ہندوستان میں خواتین کے حقوق کی ایک نئی لہر دیکھنے میں آئی جو ایک خوش آئندہ بات ہے مگر اس کے پسِ منظر میں ذوقی نے بیان کیا ہے کہ دلی جیسے بڑے شہر میں بھی عورت ذات محفوظ نہیں، دلی جیسے بڑے شہروں میں بھی جب عورت کی عصمت کی بات کی جاتی ہے تو کچھ غنڈہ عناصر قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے سے نہیں کتراتے اور کھلے عام قانون کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں، مصنف نے اس ناول کی کردار ناہید ناز کے ذریعے صدیوں سے دبی کچلی ہوئی عورت کے اندر فکری انقلاب کو پیش کیا ہے جس میں جیوتی اجتماعی زیادتی کا واقعہ اہمیت کا حامل ہے جہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اس بے قصور لڑکی کے لیے سراپا احتجاج ہوتے ہیں جو صرف عورت ہونے کی سزا میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔

عمران عاکف خان اس ناول کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"نالۂ شب گیر کیا ہے؟ ان جواں ہمت اور عالی حوصلہ عورتوں کی کہانی جو ثریا اور مریخ کی باشندہ نہیں بلکہ ہماری ہی زمین اور ہمارے ہی عہد کی جیتی، جاگتی ہستیاں ہیں جو بقول نعمان شوق اس ناول میں خود چل کر آئی ہیں وہ سب ایسی عورتیں جنھوں نے اپنے اپنے مقامات کی عظمت و شان میں اپنی جدوجہد سے چار چاند لگائے ہیں۔۔۔" [۵۰]

ذوقی نے اپنے اس ناول میں جس مخصوص مغربی مرد مخالفت تانیثیت پر بات کی ہے وہ اردو ناول کے لیے ایک نئی بات تصور کی جائے گی اور مغرب چونکہ اس کی شروعات بہت پہلے سے کر چکا ہے، جدید اردو فکشن میں ذوقی کا نام سرفہرست آئے گا کیونکہ انہوں نے اپنے اس ناول میں باقاعدہ طور پر تانیثی فکر کے اثرات کو قبول کرتی ہوئی ایک مشرقی مسلمان عورت کو دکھایا ہے جو ادب کی تاریخ میں ایک منفرد تجربہ ثابت ہوا ہے۔

یہ ناول انوکھے خیالات کا مجموعہ ہے جو مہذب سماج پر طنز کے تیر چلاتا ہے۔

احمد جاوید اس ناول کے بارے میں اپنے تاثرات کچھ ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

"آج کی عورت کے مسائل کو آج کی دانش کی روشنی میں جس شدت کے ساتھ اور جتنا ابھار کر ذوقی نے پیش کیا ہے یہ ان کا ہی حصہ اور الگ الگ واقعات و حکایات کی کڑیاں جوڑ کر ناول بنانے کا انداز بھی برا نہیں۔۔۔" [۵۱]

سیمیں کرن نے مشرف عالم ذوقی سے اس ناول کے متعلق طویل مکالمے کیئے ہیں جو مختلف اخبارات میں شائع بھی

ہوئے ،اس ناول کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ کریں۔

"نالۂ شبِ گیر نے زخم کھروچ دیے۔بچپن سے ہی مجھے مردانہ سماج کے یہ محاورے
یاد رہے کہ عورتاں دی مت گت پچھے۔بزدلوں کو عورت ہونے کا طعنہ۔بچپن سے
ہی عورت بہت ساز ہر پیتی آئی ہے۔۔۔یہ ناول اتنا بھرپور ہے کہ ایک مدت تک
ذہن پہ حکومت کرے گا۔۔۔ " [۵۲]

ذوقی نے اس ناول کو مکمل طور پر ایک عورت کی روداد کی طور پر پیش کیا ہے مگر ساتھ میں کہیں کہیں معاشرتی برائیوں پر بھی نظر ڈالنا نہیں بولتے ،اپنے ناول "لے سانس بھی آہستہ " میں انہوں نے اس موضوع کو زیرِ بحث لانا ضروری سمجھا تھا کہ اولاد بالغ ہوتے ہیں اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو جاتی ہے اور والدین کو تنہا چھوڑ کر اپنی زندگی جینے نکل جاتی ہے یہ موضوع ہمیں "پوکے مان کی دنیا" میں بھی نظر آتا ہے اور زیرِ بحث ناول میں بھی ایک ضمنی کردار کی زبانی انہوں نے اس تلخ پہلو کو بیان کیا ہے۔

"زندگی ایک چھلاوا ہے بیٹی...اچھا کیا جو تم۔۔۔میرے بھی دو بیٹے تھے۔ایک سنگاپور
میں دوسرا امریکہ میں...ایک عمر میں دولت نشہ بن جاتی ہے۔پرندے اڑ جاتے ہیں
اور بوڑھے موت کے انتظار میں اکیلے رہ جاتے ہیں۔ " [۵۳]

"نالۂ شبِ گیر" اکیسویں صدی کا نمائندہ ناول ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے اکثر علامات کا استعمال کیا ہے،جنسی موضوعات پر اکثر علامات کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے مگر زیرِ بحث ناول میں خوبصورت انداز میں رینگتے سانپ ،جھولتی ہاتھی کی سونڈ ، بلی جو چوہے کو کھانے کے درپے ہے ایسی کئی علامات دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ناول کی کامیابی کا راز یہ بھی ہے کہ عورت کے مسائل کو ان کی سماجی اور نفسیاتی کیفیت کے مطابق پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذوقی تمام کرداروں سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں،انہوں نے ناول کے تمام حصوں کو بڑی خوبصورتی اور مہارت سے پیش کیا ہے اس میں عورت ایک آزاد غراتی ہوئی بلی کی صورت میں پیش کی گئی ہے جبکہ مرد ایک چوہے کا درجہ پاتا ہے جس کے شکار کے لیے بلی ہر وقت تاک میں بیٹھی ہوتی ہے،ان علامات کے ذریعے مصنف نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ نئی صدی عورت کی صدی ہے اور ناول کا اختتام یقینی طور پر مرد سماج کے لیے بے چینی کا مکمل اشارہ ہے بلکہ اگر اس ناول کو اردو ناول کا نیا ڈسکورس اور انوکھا تجربہ کہا جائے تو غلط نہ تصور ہوگا۔

اکثر نقادوں نے اس ناول کوایک بالغ ناول کا درجہ دیا ہے جوعورتوں کے نفسیاتی مسائل کی گرہیں کھولنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، ذوقی نے اس ناول میں جو کچھ بھی لکھا اس کا تخم ہزاروں سالوں سے تیار کیا جا رہا تھا جس کے اظہار کے لئے انہوں نے قلم کے آوزار کا استعمال کیا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ذوقی نے اس ناول کے ذریعے عورتوں کے دبے کچلے جذبات واحساسات کی کہانی بیان کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

"نالۂ شبِ گیر" کا پلاٹ دُہرا ہے اس میں دولوگوں کی کہانیوں کے ذریعے ان کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے ایک کہانی جو ناول کی ابتداء میں شامل ہوتی ہے وہ صوفیہ مشتاق کی ہے جبکہ آگے کی کہانی ناہید ناز کی ہے، مصنف نے دونوں کرداروں کو الگ اور منفرد انداز میں ایک دوسرے سے ملوایا ہے مگر دونوں کی کہانیاں الگ الگ ہیں جس کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک بڑے کینوس کا ناول ہے۔

۳۹۵ صفحات پر مشتمل یہ ناول عورت کی بغاوت کی داستان ہے۔

ذوقی نے ناول کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے جس سے قاری کے لیے مشکلات پیدا ہوتی ہیں انہوں نے ناول کے سات حصے کیئے ہیں اوران کو درج ذیل نام دیئے۔

دہشتِ خوف

آتشِ گل

ریگ جنون

بحرظلمات

وادی اسرار

بارش سنگ

سفر آخرِ شب

مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کے ذریعے سوالات اٹھائے ہیں جن کے جواب نہ تو سماج کے پاس ہیں اور نہ ہی مذہب کے پاس مگر اس ناول کے مطالعے کے بعد قاری کے لئے غور وفکر کی نئی راہیں ضرور روشن ہوتی ہے۔

مصنف نے کرداروں پر خاص محنت کی ہے کرداروں کے ذریعے ہی انہوں نے دنیا کے بدلنے کی گواہی پیش کی ہے۔

کہانی میں دو مرکزی کردار گردش کرتے ہیں جو دونوں ہی نسوانی کردار ہیں، یہ ناول ذوقی کا پہلا ناول ہے جس

میں انہوں نے نسوانی کرداروں کو مرکزیت عطا کی ہے۔

سب سے پہلے جو عورت قاری کے سامنے آتی ہے وہ صوفیہ مشتاق کے کردار کے ذریعے آتی ہے ایک ڈری سہمی ہوئی مشرقی عورت جو خوبصورت، پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بڑھتی عمر کے ساتھ شادی نہ ہونے کے خوف میں مبتلا ہوتی ہے اور اس کی نفسیاتی کج روی کی وجہ بھی اس کا اپنا خاندان ہوتا، اس کے بہن بھائی ایسے بوجھ تصور کرنے لگتے ہیں۔

ذوقی نے ایک ایسی عورت کا عکس پیش کیا ہے جو کمزور ہونے کا گلہ تو کرتی ہے مگر خود کو مضبوط نہیں کر پاتی، یہ کردار ہندوستان کی صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسنے والی عورت کا کردار ہے جو صرف آنسو بہا سکتی ہے مگر اس کردار میں بھی حرکت ہوتی ہے سماج میں پلنے والی بدعتوں کے خلاف بے باکی سے اپنا ردِّعمل دیتی ہے صوفیہ کے ذریعے ذوقی نے ان تمام شریف گھرانوں کی عورتوں کی عکاسی کی ہے جو جہیز نہ ہونے کے سبب ساری زندگی کنواری رہ جاتی ہیں اور گھر والوں کا بوجھ بننے کا طعنہ قبر تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

صوفیہ سے ایک بڑی عمر کا شخص اس بنا پر شادی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے ایک رات اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے اس پر صوفیہ مان جاتی ہے، اس کے گھر والوں کو امید نہیں ہوتی کہ ایسا وہ قبول کرے گی مگر اس معصوم سی لڑکی نے ایسا قدم اٹھایا جس کی توقع اس کردار کی مالک کسی عورت سے نہیں کی جا سکتی تھی مندرجہ ذیل اقتباس کے مطالعے سے صوفیہ مشتاق احمد کی نفسیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> "نظر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے... دیکھنے پر ٹیکس نہیں ۔۔۔ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔اسی لیے تمہاری شرط کے بارے میں سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا۔۔۔یقین مانو، میرے گھر والوں نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو برا مان جائے گی۔مگر میں نے ہی آگے بڑھ کر کہا... بہت ہو گیا... آخری تماشا بھی کر ڈالو... " [۵۴]

اس کردار کے ذریعہ مصنف نے عورت پر ہونے والے استعصال کا چہرہ بے نقاب کیا ہے جہاں ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ صوفیہ مشتاق جب ایک اچھے ہمسفر کا ساتھ پالتی ہے تب بھی وہ ذہنی کشمکش میں رہتی ہے اس کی نفسیات اسے ہر وقت اسی گمان میں گم رکھتی ہے کہ وہ بھی اس سے چھن جائے گا اسی کشمکش میں وہ ناول کے اختتام پر ذہنی مریضہ کے روپ میں سامنے آتی ہے کیونکہ وہ اپنے غموں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور یہی طلاطم اس کی نفسیاتی بگاڑ کا موجب بنتا ہے۔

ناول کے دوسرے باب " آتشِ گل " میں ناہید ناز کا کردار سامنے آتا ہے مصنف کے ساتھ اس کی ابتدائی گفتگو کے مطالعے سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کردار صوفیہ مشتاق کے مترادف ہے وہ عورت کی اپنی شناخت ہونے پر بحثیں کرتی ہے، وہ شادی شدہ ایک بچے کی ماں ہونے کے باوجود اپنی الگ پہچان رکھتی ہے اور ان فرسودہ باتوں پر یقین نہیں رکھتی جو مشرقی عورتوں سے منسوب کردی گئی ہیں۔

اپنے کمسن بچے کے ساتھ وہ " جیوتی گینگ ریپ " کے احتجاجی مظاہرے میں جذباتی انداز میں شامل ہوتی ہے، جیوتی گینگ ریپ پر وہ اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کرتی ہے جس میں اس کا شوہر بھی اس کا ہم خیال ہوتا ہے ناہید ناز کے کردار کے اندر مرد ذات کے لیے ایک زہر تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ اس کے پورے جسم میں پھیلتا گیا اور ناول کے آخری حصے میں مکمل طور پر باہر آجاتا ہے عورت ذات کے لئے اس کے خیالات مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کریں۔

> " لڑکیاں پیدا ہوتے ہی شہد کی طرح ایک جسم لے کر آجاتی ہیں۔ اور سب سے پہلے اپنے ہی گھر میں اپنے میٹھے جسم پر چبھتی اور ڈستی ہوئی آنکھوں سے خوفزدہ ہوجاتی ہیں۔۔۔ مرد اپنی فطرت بدل ہی نہیں سکتا۔ " [۵۵]

ناہید ناز کے مکالموں کے مطالعے کے بعد صوفیہ اور اس کے خیالات میں واضح فرق عیاں ہوجاتا ہے۔

ناہید ناز جو مردوں سے شدید نفرت کا اظہار کرتی ہے، مصنف ابتدائی ملاقات سے ہی اندازہ لگالیتا ہے کہ اس کی زندگی میں ایسا کوئی واقعہ ضرور پیش آیا ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی بددل ہوگئی ہے ناول کے آخری حصے میں ناہید ناز خود اس حقیقت سے پردہ فاش کردیتی ہے جس کے مطالعہ کے بعد قاری کے جذبات اس کردار کے لیے مزید بڑھ جاتے ہیں اور اس کی شدید حرکات بھی قاری کو اس کردار سے نفرت پر مجبور نہیں کرپاتی۔

ناہید ناز ایک باغی کردار کی مالک عورت ہے اس نے اپنے گھر میں ایک ایسے جنسی کھیل کو دیکھا ہے جس کے بعد وہ خاموش نہیں رہ پائی، وہ ایک ایسے خاندان سے تھی جہاں معصوم بچیاں بھی اپنے خون کے رشتے داروں کی ہوس کا نشانہ بن رہی تھیں اور اس پر آواز بلند کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا وہ بچپن سے ہی اس جنسی استحصال کو دیکھتی ہے مگر خاموش نہیں رہتی، اس کی اس جرات کو دیکھ کر اس کی ماں جو خاموش مورت تھی اس میں بھی جان آجاتی ہے، اس کی چچازاد بہن ایسے ہی ماحول میں غیرت کے نام پر ماردے دی جاتی ہے جس پر ناہید ناز کی زبانی ذوقی نے ایسے جاندار مکالمے ادا کروائے ہیں جن کی مثال اردو ادب میں کم ہی ملتی ہے۔

> " اس گھر کے مردوں کو غیرت سے واسطہ بھی ہے ... کس غیرت کی باتیں کرتے

ہیں یہ لوگ...ارے اس گھر کی لڑکیاں تو پیدا ہوتے ہی ان مردوں کے سائز تک سے
واقف ہو جاتی ہیں۔۔۔ یہاں مرد اپنے گھر میں شکار کرتے ہیں۔ مرغیاں، بکریاں
اور میمنے تک ان شریف مردوں کے سائز سے واقف ہیں۔" [۵٦]

ایسے درندہ صفت لوگوں کے بیچ میں وہ نہیں رہ سکتی تھی، ایک دن اس کو بھی انہی حالات کا سامنہ تھا جو اس حویلی کی ہر جوان ہوتی لڑکی کو کرنا پڑتا ہے مگر ناہید ناز کمزور نہیں تھی، وہ اپنا دفاع کرنا جانتی تھی اس بے جان حویلی کو گرتے ہوئے دیکھتے ہوئے اس نے اس حویلی کو خیر باد کہہ دیا، ناہید ناز نے اپنی نئی زندگی تو شروع کر دی مگر وہ اس ماضی کو نہ بھول پائی اور ماضی کی تلخیاں اس کی زندگی کے خوشگوار پلوں پر حاوی آ گئیں، اُسے بچپن میں جس طرح کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا سامنا کرنا پڑا وہ اس کا ذمہ دار پوری دنیا کے مردوں کو ٹھہراتی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے حد سے زیادہ پیار کرنے والے شوہر کو بھی انتقام کا نشانہ بناتی ہے اور ہر وقت اسے ذہنی اذیت سے دوچار کرتی ہے وہ اسے اپنا لباس پہنا کر اپنی تسکین کرتی ہے، گھر کے کام کرواتی ہے یہاں تک کہ اسے نوکری چھوڑ کے بیٹے کی پرورش پر معمور کرنا چاہتی ہے، ایک اقتباس کے ذریعے اس کردار کی نفسیات کا مطالعہ کیجیے۔

"میں چاہتی ہوں۔تم گھر سنبھالو۔ گھر کی چادریں ٹھیک کرو۔ باشا کو
دیکھو۔۔۔" [۵۷]

ناہید ناز کے کردار میں ہمیں مغرب کی شدت پسند تانیثیت اور خاص طور پر مرد مخالف تانیثیت کے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ناہید کا شوہر کمال اسے ایک لغت کی تیاری کا کام دیتا ہے جس پر وہ بہت محنت کرتی ہے مگر جب وہ لغت تیار ہوتی ہے تو اسے ایک مرد مخالف متن کہا جاتا ہے جس پر کمال شدید پریشانی کا شکار ہوتا ہے مگر ناہید متمعین ہوتی ہے اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"عورتوں کے حصے کے تمام نام میں نے مردوں کے کھاتے میں ڈال دیے
ہیں۔ مثلاً داسی، طوائف۔۔۔ بے حیا، فاحشہ... رنڈی... " [۵۸]

اس کردار کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ یہ کردار مرد بننا چاہتا ہے وہ خود کو مرد کے برابر کرنے کی بجائے مرد بنتا ہوا دیکھنا چاہتی ہے ناول کے آخری حصے میں اس کردار کا انتقامی جذبہ انتہا کو پہنچتا ہوا نظر آتا ہے جہاں وہ اپنے ہی شوہر کی مردانگی ختم کرنے کے درپے ہوتی ہے، وہ مرد ذات کے لیے چوہے کا لفظ استعمال کرتی ہے اور چوہوں کے خاتمے کے لیے کوشاں ہوتی ہے، لغت کی تیاری کے بعد جب وہ مسترد کر دی جاتی ہے تو ناہید ناز ایک غیر ملکی لٹریری ایجنسی سے رابطہ کرتی ہے جہاں اسے اس کام کو جاری رکھنے کے علاوہ دو کروڑ کا

چیک بھی وصول ہوتا ہے، وہ اپنے شوہر کمال کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسا لیتی ہے جہاں وہ اس غیر ملکی تنظیم کی رکن بنتی ہے جس میں مرد ارکان کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے کیونکہ یہ تنظیم مرد مخالف ادارہ ہے اور اس میں ناہید ناز جیسے خیالات کی حامل اراکین شامل ہیں جو مرد ذات کے علاوہ بھی خوشگوار زندگی گزارنے کا تصور کرتی ہیں۔

ناول میں ایک کردار کمال یوسف کا بھی ہے جو ناہید ناز کا شوہر ہوتا ہے مگر درحقیقت وہ ناہید کے انتقام کا نشانہ بنتا ہے، یہ کردار عورت کی آزادی کا حامی ہے اپنی بیوی کو مکمل آزادی دیتا ہے مگر وہ ناہید کا اعتماد نہیں حاصل کر پاتا، اپنے بیٹے کے لئے وہ ناہید کے تمام کہنے مانتا ہے اور اس کے اکثر خیالات سے اتفاق بھی کرتا ہے۔

"ناہید ناز کا عمل غلط ہوسکتا ہے۔ مگر اس کی باتوں میں دم ہے۔ یہاں صدیوں کی قیدی عورت ہے، جس کا مردوں نے ہر سطح پر استعصال کیا ہے۔ اور آج صدیوں کے ظلم سہنے کے بعد وہ عورت اگر ناہید ناز کے وجود میں سانس لے رہی ہے تو وہ مجرم کیسے ہے؟ غلط یہ ہے کہ مردوں کا یہ انتقام صرف اس کے لئے لیا جارہا ہے۔ یعنی ایک ایسے مرد سے جو شاید لڑنا بھی بھول چکا ہے۔" [۵۹]

اس اقتباس کے مطالعے سے اس کردار کی بے بسی کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے یہ کردار زندگی میں سکون کا متلاشی ہوتا ہے ناہید کا ہر وار سہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ عورت کے ساتھ صدیوں سے کیے جانے والے ناروا سلوک کے بدلے آج کی عورت کا انتقام جائز ہے مگر وہ بالآخر تھک جاتا ہے، ناہید کے جانے کے بعد بھی وہ اسے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھتا مگر بالآخر وہ صوفیہ کو اپنا لیتا ہے تب اسے خوشی کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر وقتی طور پر، صوفیہ دراصل کمال کی بے جا محبت کو سہہ نہیں پاتی اور اس کی احساسِ محرومی دراصل اس کی نفسیاتی بگاڑ کا موجب بنتی ہیں، ایسے میں کمال یوسف ایک بے بس مرد کا کردار بن کر سامنے آتا ہے جس کو نہ تو ناہید ناز پیار دے پائی اور نہ ہی سکون کی زندگی اُسے صوفیہ کے ساتھ نصیب ہوئی۔

ناول میں ایک اہم کردار مصنف کا بھی ہے جو واحد متکلم ہے، مصنف اپنی زبانی خیالات کا تذکرہ کرتا ہے اور کمال یوسف، ناہید ناز اور صوفیہ مشتاق کے ساتھ طویل بحث ومباحثہ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ناول میں جب جب مصنف حاوی ہوتا ہے تو کہانی روانی سے ہٹ کر دوسری صورت اختیار کر لیتی ہے۔

مرقع نگاری اس ناول میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے چند مثالیں ملاحظہ کریں۔

"چہرہ کوئی خاص نہیں۔ گیہوں رنگ۔ ناک تھوڑی موٹی تھی۔ بدن دبلا تھا۔ قد بھی پانچ فٹ سات انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ وہ آسمانی جینس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہنے تھا۔" [۶۰]

ناہیدناز کے کردار کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ایک سانولا معصوم چہرہ۔عمر یہی کوئی ستائیس اٹھائیس کے قریب،قد پانچ فٹ دوانچ سے کچھ زیادہ۔ستواں بدن۔چہرے پر معصومیت کے ساتھ ایک کشش بھی تھی۔" [۶۱]

ایک ضمنی کردار کا مرقع ذوقی مندرجہ ذیل الفاظ کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

"سر پر گرم ٹوپی تھی۔سفید چہرہ اس وقت کچھ زیادہ ہی سفید ہو گیا تھا۔ناک لال سرخ ہو رہی تھی۔قد بھی کوئی پانچ فٹ ۸ انچ کے قریب۔دبلے پتلے۔ آنکھیں فکر میں ڈوبی ہوئی۔۔۔" [۶۲]

زیرِ نظر ناول میں منظر نگاری کم دیکھنے کو ملتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصنف چونکہ کہانی اپنی زبانی بیان کرتا ہے تو مناظر کم ہی اجاگر ہوتے ہیں مگر قدرتی مناظر کو ذوقی نے خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

"ہری بھری گل پوش پہاڑیوں کے درمیان کئی خوبصورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ خوشگوار موسم، پہاڑی جھیلوں اور جھرنوں کی مترنم آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔۔۔حسین پھولوں اور سبز پتوں والے درختوں کی نہ ختم ہونے والی قطار کے درمیان سفری بیگ۔۔۔" [۶۳]

ذوقی جذبات نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں ایک مثال ملاحظہ کریں۔

"سنگل بیڈ کا دیوان پڑا تھا۔چادر کئی دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی۔کمرہ بے رونق تھا اور یقیناً اس کمرے میں کھڑکی کے راستے گھنے کہرے داخل ہو جاتے ہوں گے۔" [۶۴]

زیرِ بحث ناول میں مکالمہ نگاری کو مکمل طور پر اپنایا گیا ہے مختلف کرداروں کی زبانی ذوقی نے جاندار مکالمے ادا کروائے ہیں خاص طور پر ناہید ناز کی بے باکی اور صوفیہ مشتاق کی بے بسی کا اظہار جس طرح سے ذوقی نے کیا ہے۔ ایک ایسا ہی مکالمہ ملاحظہ کریں جس سے معاشرے کی کج روی بھی سامنے آجاتی ہے اور ایک بے بس لڑکی کے جذبات کی عکاسی بھی ہو جاتی ہے۔

" کون نہیں مرے گا ایسے۔جب آپ بار بار اسے سجا کر باہر لے جاتے ہوں۔ یا کبھی کبھی سج دھج کر گھر میں ہی نمائش یا میلہ لگا دیتے ہوں۔ایک حد ہوتی ہے۔کوئی بھی کتنی بار مرتا ہے۔کتنی بار مر سکتا ہے کوئی۔میں تو ہر بار، ہر پل۔۔۔" [۶۵]

ناول میں طویل مکالمات کی بھر مار ملتی ہیں جن کو یہاں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ناول میں اسلوب خاص اہمیت کا حامل عنصر ہے، بہتر سے بہتر موضوع بھی تب تک قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا جب تک اسے پر تکلف اور موثر زبان و بیان کے ساتھ نہ پیش کیا جائے، اچھے ناول کے لئے مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا اسلوب اختیار کرے جو قاری کو اپنی طرف کھینچنے کے ہنر سے واقف ہو۔

ذوقی کے فنی اسلوب کی پختگی اور فنکارانہ اظہار کا راز بھی اسلوب و اندازِ بیاں میں چھپا ہے، زیرِ بحث ناول میں بھی انہوں نے جاندار اسلوب کا سہارا لیا ہے۔

ذوقی نے ناول کو بیانیہ تکنیک میں بیان کیا ہے جبکہ اس ناول میں مغربی فکشن کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہ وہ اس ناول میں ناول کی روایت سے تکنیک اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انہوں نے جو استعاراتی اسلوب اپنایا ہے اس پر اکثر ناقدین نے اس عمل کو سراہا ہے، ان کے اسلوب میں ادبی دانشوری دیکھنے کو ملتی ہے۔

ذوقی کے اندازِ بیاں کے حوالے سے جہاں ان کی تعریف کی گئی وہیں تنقید کا بھی نشانہ بنایا گیا اس حوالے سے شموئل احمد کے خیالات ملاحظہ کریں۔

> "ذوقی نے اسلوب میں جدت پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔لیکن جگہ جگہ ان کے مداخلت فن پر ضرب لگاتی ہے۔تخلیق کو تخلیق کار سے زیادہ ذہین ہونا چاہیے۔ذوقی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے زیادہ ذہین نظر آتے ہیں اور اپنے قاری کی آئی۔کیو پر شک کرتے ہیں۔اس لئے بیانیہ میں جگہ جگہ تشریحی نوٹس بھی لگاتے ہیں۔اس طرح وہ آگے آگے چلتے ہیں اور کہانی پیچھے پیچھے چلتی ہے۔" [٦٦]

ناول کی زبان شستہ اور رواں ہے، کہیں پر بھی ابہام کا گمان نہیں ہوتا جبکہ باقی ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی اکثر ادبی حوالے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

ذوقی نے کرداروں کے مطابق زبان کا استعمال کیا ہے۔

اشعار کا استعمال وہ کثرت سے کیا کرتے ہیں، زیرِ نظر ناول میں بھی اکثر اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔

"بیگانی ہوئی جاتی ہے مجھ سے میری تصویر
اے نالئہ شبِ گیر
کیا کہتی ہے مجھ سے میری روٹھی ہوئی تقدیر
اے نالئہ شبِ گیر۔۔۔" [٦٧]

" کیوں لکھنے لگا کوئی میرے درد کی تفسیر

اے نالۂ شبِ گیر " [۶۸]

چوتھے حصے "بحرِ ظلمات" کی ابتداء سدرہ سحر عمران کی ایک نظم سے کی گئی ہے۔

"مقدس کتاب کہتی ہے۔

کہ ہم گرتے رہیں گے بار بار۔۔۔" [۶۹]

"وادی اسرار" کے آغاز میں اقبال کا مندرجہ ذیل شعر شامل کیا گیا ہے۔

"سوئے گردوں نالۂ شبِ گیر کا بھیجے سفر

رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے" [۷۰]

مذہبی تہواروں کو بھی ناول کا حصہ بنایا گیا ہے خاص طور پر محرم میں نکلنے والے جلوسوں پر پڑھے جانے والے نوحوں کو بھی اسلوب کا حصہ بنایا گیا ہے۔

"خیمے سے برآمد ہوئے زینب کے جو دلبر

دیکھا کہ حسین ابن علی روتے ہیں در پر

بس جھک گئے تسلیم کر حضرت کی وہ صفدر" [۷۱]

اسلوب میں نیا رنگ بھرنے کے لیے ذوقی انگریزی حروف کا استعمال بھی کرتے رہتے ہیں۔

زیرِ بحث ناول میں بھی یہ تاثر دیا جا سکتا ہے کہ وہ کرداروں کی زبان سے انگریزی حروف کا استعمال کرتے ہیں مثال ملاحظہ کریں۔

"صدیوں کی غلامی، Chestity Belt سے ہو کر گزرنے والے خوفناک

قصے ___ یہاں مرد حاکم تھا۔" [۷۲]

"لورز پوائنٹ، آئس ہل کی سیر، کشتی بانی اور نڈلس، آئس کریم کھانے کے بعد

ہم دوبارہ گھر کی طرف چل پڑے۔" [۷۳]

ذوقی کے اس ناول کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عورت کی آزادی کے قائل ہیں تب ہی تو انہوں نے اس مردانہ سماج میں مرد ہو کر بھی عورت کے لیے بات کرنی ضروری سمجھی جو کہ ایک قابل تحسین امر ہے۔

مرگِ انبوہ

مرگِ انبوہ ۲۰۱۹ء میں منظر عام پر آیا جس کا انتساب فکشن کی عظمت کے نشان اور عظیم انسان سید محمد اشرف کے نام کیا گیا۔

۴۳۲ صفحات پر مشتمل یہ ناول عصرِ حاضر کے ہندوستان کی تصویر ہے ذوقی کی تحریروں کے موضوعات عصرِ حاضر کے ہندوستان کے مسائل کے گرد گردش کرتے ہیں انہوں نے اکیسویں صدی میں ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل پر گہری نظر رکھی ہے، ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ معاشرے میں کوئی بھی برائی دیکھتے ہیں تو فوراً اسے تحریری شکل میں سب تک پہنچاتے ہیں جس وجہ سے انہیں اکثر نقصانات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ غیر جانبداری سے حقائق کو عوام تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

"مرگ انبوہ" ان کا تازہ ترین ناول ہے اس سے پہلے وہ اپنے ناولوں میں سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی معاملات کو حصہ بنا چکے ہیں۔

"مرگ انبوہ" میں بھی انہوں نے وہی اندازِ تحریر اپنایا ہے جو اپنے دیگر ناولوں میں اپناتے ہیں ان کا ہر ناول مختلف موضوعات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتا ہے زیرِ بحث ناول میں بھی ہمیں ایک عہد سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے، میڈیا کی جانبداری نظر آتی ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی بے بسی نظر آتی ہے، مسلمان طبقے کا استحصال نظر آتا ہے، طاقت اور پیسے کا ڈسکورس نظر آتا ہے حتیٰ کہ ہندوستانی معاشرے کی عصرِ حاضر کی ایک زندہ تصویر ذوقی کے اس ناول میں نظر آتی ہے اسی بدولت "مرگ انبوہ" کو آج کا ناول کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس ناول میں بدلتا ہوا ہندوستان دیکھا جا سکتا ہے۔

ناول میں جا بجا علامتوں کا استعمال کیا گیا ہے جس وجہ سے اسے اپنے عہد کی زبردست علامتی داستان کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھنا چاہیے، یہ ناول اردو ناول کی تاریخ میں بہترین شاہکار ہے۔

ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ہندوستان کی گھناؤنی سیاست کا پردہ چاک کیا ہے انہوں نے اشاروں، کنایوں اور تمثیلوں کا کم استعمال کیا اور کھلے الفاظ میں اس کا چہرہ منظرِ عام پر لایا ہے انھوں نے آج کی نوجوان نسل کے نفسیاتی مزاج کو بھی بہت عمدگی کے ساتھ ناول کا حصہ بنایا ہے۔

ذوقی خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ انہوں نے اس ناول میں بھی ہندوستانی سیاست کا مکروہ چہرہ سب کو دکھایا ہے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علائم و رموز کا استعمال کیا ہے تا کہ یہ ناول صحافتی اسلوب

میں نہ درج ہو جائے بلکہ انہوں نے علامتوں کا استعمال کر کے دلکشی عطا کی ہے۔
ناول کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ "مرگ انبوہ" ہے کیا؟
مرگ انبوہ جسے انگریزی میں ہالوکاسٹ کہا جاتا ہے دراصل یہودیوں کی نسل کشی سے منسوب ہے، دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی کے چانسلر ہٹلر کی نازی فوج کے ہاتھوں یہودیوں کا قتل عام کیا گیا اسے یہودیوں کی نسل کشی بھی کہا جاتا ہے۔
ہالوکاسٹ درحقیقت یونانی لفظ سے بنا ہے جس کے معنی" مکمل جلا دینا" کے ہیں لاکھوں یہودی مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا اگر ان کی تعداد کا اندازہ لگایا جائے تو تقریبا نو سو گیارہ ملین تک جا پہنچتی ہے جسے مرحلہ وار انجام دیا گیا تھا۔
یہاں سوچنے کی بات ہے کہ ذوقی نے اس ناول کا نام مرگِ انبوہ رکھا ہے تو ظاہر ہے وہ ہندوستان کے حالات میں بھی وہی تبدیلیاں دیکھ رہے ہیں، ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی آہستہ آہستہ اس ہالوکاسٹ کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر فیضی اس ناول میں ذوقی کے جذبے کی قدر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> "مشرف عالم ذوقی ادیب سے کہیں زیادہ ایک مسلمان یا ہندوستانی بن گئے ہیں۔ انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء کی فکر ہے اور ہندوستان کے مستقبل کے لیے حیران و پریشان ہیں، ہندوستانی ہونے کے ناطے انہیں خوف ہے کہ کہیں ہندوستانی تہذیب جنگلی وقبائلی تہذیب میں نہ تبدیل ہو جائے یا پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہندوستان پر ایک بار پھر کسی اور ملک کا قبضہ نہ ہو جائے۔" [۷۴]

ذوقی ایک محبِّ وطن ہندوستانی ہیں اس لیے وہ وطن کے لیے اور وطن کے باسیوں کے لیے پریشان نظر آتے ہیں اس ناول میں بظاہر تو مسلمانوں کی مشکلات کو بیان کرتے ہیں پر اس کے پسِ پردہ وہ یہ بات بھی عیاں کرتے جاتے ہیں کہ جہاں آج مسلمانوں کے لئے خطرات منڈلا رہے ہیں کل اس جگہ پر اور اقلیت ہوں گی۔
ناول کے موضوعات پر بات کی جائے تو سب سے پہلے جس پہلو پر بات کرنا ضروری ہے وہ شہریت کا قانون ہے جو کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نافذ کیا گیا، جس کے سہارے ان کو ستر دہائیاں گزر جانے کے باوجود بھی اپنے ہندوستانی ہونے کا ثبوت دینا پڑتا ہے، ہندو معاشرے میں ہمیشہ سے ہی ذات پات کا فرق سمجھا جاتا رہا ہے اور موجودہ ہندوستانی حکومت مکمل طور پر ہندو راج چاہتی ہے جس کے لیے وہ مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال

کرتی ہے تاکہ مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جا سکے۔

اس بارے میں ذوقی اپنے گزشتہ ناول "آتشِ رفتہ کا سراغ" میں بھی اشارہ کر چکے ہیں اور زیرِ بحث ناول میں بھی وہ اس موضوع پر قابلِ غور بحث کرتے ہیں۔

ہندوستان کی زمین مسلمانوں کے لیے روز بروز تنگ کی جا رہی ہے این۔ آر۔ سی جیسے قوانین کا نفاذ صرف مسلمانوں کے لیے کیا جا رہا ہے جہاں مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ دُہرا رویہ رکھا جا رہا ہے، ایک مسلمان کو کرایہ پر گھر نہیں دیا جاتا، مسلمان شناخت کو ظاہر کریں تو ٹیکسی تک دستیاب نہیں ہو پاتی ان سب حالات کو ذوقی نے ناول میں جگہ دے کر مسلمانوں کے مسائل کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> "جمعہ کے روز نائٹ شفٹ جانے کے لئے پاشا مرزا نے کیب بک کروانی چاہی تو جواب ملا۔ ساری سر۔ ہماری سروس مسلمانوں کے لئے نہیں ہے۔۔۔ اچانک اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ زندگی کے تمام شعبوں سے مسلمان اور اقلیت نام کے جانور کو علیحدہ کیا جا چکا ہے اور سب کچھ سوچے سمجھے منصوبوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔" [۷۵]

ہندوستان کے نوجوان خود کو ہر جگہ غیر محفوظ تصور کرتے ہیں ایسی ہی کہانی کو ذوقی نے ناول کا حصہ بنایا ہے، جہاں پر لوگوں کا پیچھا کیا جا رہا ہوتا ہے، قدم قدم پر آہٹ سنائی دیتی ہے، جہاں والدین اپنی اولاد کے مستقبل کو لے کر پریشان نظر آتے ہیں۔

کرداروں میں ذوقی نے بے بسی کو شامل کر کے مسلمانوں کے حالات کو بیان کیا ہے ایک باپ کے جذبات کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔

> "میں خود کو مفلوج و بے بس محسوس کر رہا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں دیمک جسم سے چپک گئی ہیں۔ مجھے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسی طلسمی طاقت بھی نہیں کہ اپنے بیٹے کو محفوظ رکھ سکوں۔" [۷۶]

۲۰۰۰ء کے بعد ان حالات نے سنگینی اختیار کر لی ہے، ۲۰۰۲ء میں گجرات حادثہ ہوا، اشتعال انگیز بیانات دیے گئے، میڈیا نے مکمل طور پر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا، مسلمان نوجوانوں کے لیے نوکریوں کے دروازے بند کر دیے گئے، جمہوری ریاست کے وزیر اعظم نے مسلم کمیونٹی کے لیے "کتے کا پلا" کا لفظ استعمال کیا، اخبارات میں "مسلمان نامنظور" کی سرخیاں چھاپی گئیں، نوٹ بندی کا قانون نافذ کیا گیا اور

ہندوستان میں شہریت ترمیم بل کا قیام ہندوراج کے سفر کی پہلی کامیابی ہے جس کی طرف ذوقی نے اشارہ کیا ہے کہ یہ ملک دیکھتے ہی دیکھتے ہندوراشٹر میں تبدیل ہونے لگا ہے، مسلمان اس پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، میڈیا خریدا جا چکا ہے، ہندوراج کے لیے تمام شعبے خریدے جا چکے ہیں اور مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی زمین تنگ کی جا رہی ہے اس خوفناک صورتحال کی عکاسی ذوقی نے اس ناول میں کی ہے اقتباس ملاحظہ کریں۔

> " کچھ دن قبل ایک مہاسبھا میں لاکھوں عقیدت مند ٹرک میں بھر کر لائے گئے تھے۔
> سڑک چوراہوں سے گزرتے ہوئے یہ نعرے بھی لگائے گئے کہ ایک دھکا اور دو
> جامع مسجد توڑ دو۔" [۷۷]

ذوقی نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے اس موضوع کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔

ہندوستان کے حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے ہیں، راتوں رات تبدیلیاں ہو رہی ہیں، جامن کے پیڑ پیپل کے پیڑ سے تبدیل ہو رہے ہیں، گائیں گر با کرنے لگی ہیں، مندر بننے لگے ہیں وہاں بھجن سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف تقاریر بیان کی جاتی ہے۔

> "سیاست اچانک فنتاسی کی طرف مڑ گئی تھی۔ واقعات اور حادثات کی رفتار اتنی تیز تھی
> کہ اب کوئی یہ کہتا کہ ایلین نے ہمارے ملک پر قبضہ کر لیا ہے تو مجھے کوئی حیرت نہیں
> ہوتی۔ جو حادثے ہو رہے تھے وہ خلائی مخلوق کو دیکھنے سے زیادہ پُراسرار تھے۔" [۷۸]

ذوقی نے ناول میں بظاہر فنتاسی کا سہارا لیا ہے مگر غور کرنے پر وہ حقیقت لگتی ہے کوئی بھی واقعہ ایسا بیان نہیں کیا گیا جس میں حقیقت کا شبہ نہ ہوتا ہو، ایک مکمل ہندوراج کی تصویر عصرِ حاضر کے ہندوستان میں جھلکتی ہے۔

> " سی ایم کا فیصلہ ہے کہ گایوں کا محکمہ ہی گاؤں کی دیکھ بھال کرے گا۔ ملک میں کئی
> جگہوں سے گائیں بھاگ کر لکھنؤ میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ پیپل کے درخت پر جامن
> لگ سکتا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" [۷۹]

اس اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس معاشرے میں گائے کی قربانی پر سزائیں سنائی جاتی تھی وہاں اب گائے رکھنا بھی جرم بن چکا ہے، گائے کے مالکوں کو مختلف الزامات میں پھنسایا جاتا ہے یہ ناول حقیقت کی تصویر کشی ہے تب ہی تو اس میں کوئی ایک موضوع قابلِ غور نہیں کہا جا سکتا، ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹنے سے حقائق سامنے آتے جاتے ہیں درحقیقت ذوقی نے ان تبدیلیوں کو ناول کا حصہ بنایا ہے جو پلک جھپکتے انسان کو کسی اور دنیا کی سیر کروا دیتی ہیں۔

> "سب جادو ہے۔ مایانگری۔ اور تم وہی ہو بھلے مانس۔ پرانی دنیا سے چپکے ہوئے۔

راتوں رات نوٹ بدل گئے۔حوالہ کی گاڑیاں گھومنے لگیں۔قیدی جیل سے باہر آ
کراچھے انسان بن گئے۔۔۔اونانگر میں دلتوں کو زندہ جلایا جارہا ہے۔جادو۔
سب جادو۔۔۔" [۸۰]

ہندوستان میں ایسا نظام قائم کیا جاچکا ہے جہاں معصوم مسلمانوں کو بے وجہ سزائیں دی جارہی ہیں ذوقی نے اس ناول کے ذریعے ہندوستانی معاشرے کے اس گھناؤنے چہرے کا پردہ فاش کیا ہے جہاں ایک مسلمان اگر فرطِ جذبات میں آ کر ترنگا لہراتا ہے تو بھی اسے اس کی اجازت نہیں دی جاتی ،اس کی زندگی جہنم سے بھی بدتر بنادی جاتی ہے وطن سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے جرم میں وہ گھرانہ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔
یہاں ایک سوال قابلِ غور ہے کہ مسلمان اگر وطن سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو اسے اس طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اگر وہ ان سب چیزوں سے دور رہ کر زندگی گزارتا ہے تو اسے وطن سے غداری کے طعنے دیے جاتے ہیں ایسے میں ایک مسلمان کی زندگی اجیرن ہے،صرف اپنے نام کے ساتھ مسلمان ہونے کی شرائط کا اضافہ کرتے ہی اس کے لیے زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔
ایسے واقعات آئے روز اخبارات کا حصہ بنتے رہتے ہیں جہاں مسلمانوں پر گھناؤنے الزامات لگا کر بغیر کسی ثبوت کے ان کو مجرم ٹھہرا دیا جاتا ہے اور اکثر اوقات تو بغیر کسی جرم اور سزا کے انہیں خاموشی سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے،ایسے ہی ایک واقعے کی طرف ناول میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

"جی ہاں۔ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہجوم نے بے دردی سے قتل کر دیا۔پولیس
نے پورے معاملے کو دبا دیا۔جبکہ شہادتیں تھیں،ویڈیو تھا کیس دفعہ ۳۰۴ کے تحت
درج کیا گیا۔جبکہ مجرموں پر دفعہ ۳۰۲ لگنی چاہیے تھی۔۔۔" [۸۱]

ذوقی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کو کم کیا جارہا ہے یا شاید کم ظاہر کیا جارہا ہے اس ناول میں وہ اس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ مسلم آبادی کو کم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس کے پیچھے کیا نقطہ نظر ہے وہ اس پر بھی بے باکی سے اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

" کوئی ہے جو بہت تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔جس کی نظر ہمارے لباس پر
ہے۔ہمارے کھانے پینے پر ہے۔ہماری زندگی کے طریقوں پر ہے۔ہمارے بچوں
پر ہے۔سیاہ بادلوں کے درمیان بھی اس کا چہرہ ہر شخص دیکھ رہا ہے۔مگر سب کے ہونٹ
سلے ہوئے ہیں۔" [۸۲]

ایسی ڈرامائی صورت حال کی عکاسی کسی اور ناول میں دیکھنے کو نہیں ملتی، مسلمان اس ساری صورتحال میں خود کو اکیلا سمجھتا ہے اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، انہیں ہندوؤں کی طرف سے غلیظ باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس معاملے میں ذرا بھی فنتاسی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا یہی رویہ ہے جو ذوقی نے اس ناول میں بیان کیا ہے اس کی ایک مثال ناول کے اقتباس سے ملاحظہ کریں۔

> "وہ زور سے ہنستا۔ اس بار اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ چیونٹی کے برابر بھی معاملہ ہو تو تم سالے بھونکنے لگتے ہو۔ اب ہمارا کھیل دیکھنا۔ ہم بہت جلد تمہارے گھر آئیں گے۔" [۸۳]

کسی بھی مہذب معاشرے میں اس طرح کی زبان کا استعمال نہیں کیا جاتا جیسا مسلمانوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ یہ ابتدا ہے اس ہالوکاسٹ کی جس کی طرف یہ ہندوراج جا رہا ہے ایسے میں ایک مسلمان کی بے بسی کا اندازہ ذوقی کے اس کردار کی زبانی ہو جاتا ہے۔

> "خون چوسنے والی سرخ چیونٹیاں۔ یہ کیا ہو رہا جہانگیر مرزا۔ کچھ لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔ کچھ مکانات راتوں رات جن اور بھوت اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ کچھ سرِ عام ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور کچھ خوف میں مبتلا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہم رینگنے والے کیڑوں سے بھی بدتر بنا دیے گئے ہیں۔" [۸۴]

ایک وقت تھا جب ہندو مسلمانوں میں بھائی چارہ کی مثالیں دی جاتی تھیں، ہندو مسلمان ایک دوسرے کی خوشیوں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے تھے، ہر عید میں ہندوؤں کی شرکت لازمی تصور کی جاتی تھیں اور دوسری طرف مسلمان بھی ہولی اور دیگر ہندو رسومات میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے مگر اب وقت نے حالات تبدیل کر دیے ہیں ذوقی نے اس موضوع کو بھی اپنی کہانی کا حصہ بنایا ہے کہ وہ محبت اب نفرت میں تبدیل ہوتی نظر آ رہی ہے آج وہی ہندو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں اقتباس ملاحظہ کریں۔

> "میرے ہمسایوں نے افطار پارٹی اور عید دونوں کا بائیکاٹ کیا۔ میرے پڑوسی خفیہ افسر نے صاف صاف کہا کہ آپ کے تہوار میں شامل ہونا ہمارے دھرم کے خلاف ہے۔۔۔ برہمن کو کیوں اچھوت بنانا چاہتے ہیں جبکہ یہی ہمسائے تھے جو افطار، عید، بقرعید کے موقع پر بغیر بلائے بھی ہماری خوشیوں میں شامل ہو جاتے تھے۔" [۸۵]

"آتشِ رفتہ کا سراغ" میں ذوقی اس موضوع پر قابلِ غور بحث کر چکے ہیں کہ ہندوؤں میں مسلمانوں کے لئے

نفرت ابتداء سے موجود ہے جو کہیں نہ کہیں ضرور سر اٹھا لیتی ہے زیرِ بحث ناول "مرگِ انبوہ" میں بھی کچھ ایسے مکالمے دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں ہندو کردار اپنی سفاکیت دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان پر مسلمان حملہ آوروں نے حملے کیے اس بات میں کوئی شک نہیں مگر مسلمانوں نے کبھی تلوار کے زور پر اسلام کو فروغ نہیں دیا، مسلمانوں نے کبھی ظلم کا سہارا نہیں لیا مگر ہندوستان کے ہندو اہلکار آج مسلمانوں کو اذیت دے کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے بدلہ لے لیا ذوقی نے اس سوچ کی بھی وضاحت کی ہے۔

> "انسان کبھی برابر نہیں تھے۔ برہمن، برہمن تھے۔ اچھوت، اچھوت تھے۔ تم حملہ آور بن کر آئے اور ہماری صدیوں کی پرمپرا کو حاشیہ پر ڈال دیا۔ اب ہم پراتن سے نیا جنم لے رہے ہیں تو تمہیں دکھ کیوں ہو رہا ہے؟ شروعات تو تم نے کی؟" [۸۶]

> "تم لوگوں نے ایسا بہت کچھ کیا، جو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہی کام ہم کریں تو اپرادھی۔ جزیہ مغلوں نے لگایا۔ ہم یہ کام کریں تو اپرادھی۔ تم نے ہمارے مندر توڑے ہم مسجدیں توڑیں تو اپرادھی۔ ہم نے سب کچھ تو لوگوں سے سیکھا۔" [۸۷]

ان بیانات پر ذوقی نے جواب ایک کردار کی زبانی کچھ اس انداز میں دیا ہے ملاحظہ کریں۔

> "ہم آپ دونوں اسی زمین کا حصہ ہیں۔ ہم باہر سے آئے تو آپ بھی باہر سے آئے۔ مغلوں نے جزیہ لگایا تو تحفظ بھی دیا۔ اکبر نے دوبارہ جزیہ ختم کیا۔ کسی بھی مسلمان ملک میں غیر مسلموں پر کوئی زیادتی نہیں ہوتی۔۔۔" [۸۸]

ہندوؤں کی تنگ نظری پر اس سے بہتر جواب نہیں دیا جا سکتا، ذوقی تاریخ کا گہرا علم رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہیں ناول کو ترتیب دیتے ہوئے حقائق سامنے رکھنے کی ضرورت نہیں پڑی وہ سب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ ناول میں تنگ نظر ہندو کرداروں کے انداز بیان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زندگی میں ذوقی کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے جس کی تلخی ان کے ناولوں میں بھی نظر آتی ہے۔

ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے لئے نفرت کا بیج ہزاروں سالوں سے بو دیا گیا جواب سامنے آ رہا ہے ایسے خیالات کے کچھ کرداروں کو ذوقی نے ناول میں جگہ دی تاکہ ان کے اندر پلنے والے زہر سے سب کو آشنا کر سکیں اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں، انہوں نے بظاہر اس ناول کا موضوع شہریت ترمیمی بل کو بنایا ہے مگر درحقیقت وہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔

ذوقی نے علامتوں کا استعمال کیا ہے ایسی ہی ایک علامت بی مشن ہے جو پورے ہندوستان پر چھائی ہوئی نظر آتی

محفوظ نہیں ایک خاص ہندو خیالات کی عکاسی کرنے والی تنظیم کو ناول کا حصہ بناتے وقت ذوقی کے ذہن میں کس تنظیم کا خیال تھا وہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں آج بی۔جے۔پی اور آر۔ایس۔ایس جیسی مسلم مخالف تنظیمیں وہی کچھ کررہی ہیں جو ذوقی نے اس ناول میں بی مشن کے ذریعے بیان کیا ہے۔

بی مشن کا استعارہ انہوں نے اسی لیے استعمال کیا کیونکہ براہِ راست ان تنظیموں کے نام استعمال کرنا اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا تب ہی انہوں نے بی مشن کے لبادے میں ان تمام مسلم مخالف پارٹیوں کے پول کھول دیے ہیں، بی مشن نامی تنظیم کتنی مضبوط ہے اور اس نے ہندوستان میں اپنے پنجے کتنے گاڑھ لیے ہیں۔ اس کی وضاحت ذوقی ناول میں ایک کردار کی زبانی کردیتے ہیں ملاحظہ کریں۔

"بی مشن کی شاخیں ایک لاکھ سے زیادہ ہیں اور اب ان کا دائرہ کینیا، تنزانیہ، یوگنڈا، ماریشس، جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک تک پھیل چکا ہے۔ ان کی تنظیموں میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ یہ ہر مشکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ کیا انہیں روکا جاسکتا ہے۔" [۸۹]

اقتباس کی آخری لائن کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو بھی اپنے مہرے بنا رکھے ہیں انہوں نے مسلمانوں کو معاشی طور پر اتنا کمزور کردیا کہ ان کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں بچا، ایسا ہی ناول کے مرکزی کردار کے ساتھ ہوا مگر اپنی آئیڈیالوجی اور ضمیر کا سودا کر کے بھی وہ ان کا ساتھ نہیں دے پائے مگر ہم مجموعی طور پر جائزہ لیتے ہیں تو اکثر مسلمان کردار بی مشن کے اشاروں پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں جنہیں وہ اپنے مقصد کے پورا ہونے تک اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور پھر موت ان کا مقدر ہوتی ہے ایسا ہی ناول کے مرکزی کردار جہانگیر مرزا کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ جانے کتنے لوگ اس دلدل میں گھرتے ہیں جہاں سے باہر نکلنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے ایسے میں ایک مسلمان کردار کی زبانی ذوقی حالاتِ حاضرہ کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"پورے ہندوستان کو غور سے دیکھو۔ کیا تم غور کررہے ہو کہ تم آہستہ آہستہ غائب کئے جارہے ہو۔ یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا۔ بی مشن کی شاخیں بڑھ رہی ہیں۔ وہ فوجی تربیت کے لیے اسکول کھول رہے ہیں۔ ان کی دیش بھکتی کا سرٹیفکیٹ آپ کے لئے نہیں ہے۔ پھر آپ کو کیا کرنا ہوگا؟" [۹۰]

بی مشن کا مقصد مندرجہ ذیل اقتباسات کے ذریعہ سامنے آجاتا ہے۔

"وہ ہماری شناخت خرید رہے ہیں۔ پھر ہم بے شناخت ہوجائیں گے۔ اس کا

مطلب سمجھتی ہو۔یعنی جسم تو میرا ہے مگر جسم کے اندر جو روح ہے وہ میری نہیں۔
پاؤں میرے ہیں مگر چلنا مجھے اپنی مرضی سے نہیں ہے۔ہاتھ میرے ہیں مگر مجھے
وہی کرنا ہے جو وہ چاہتے ہیں۔زبان اور ذائقہ پر ان کی مہر ہے۔" [۹۱]

ذوقی نے اس موضوع کو ناول میں شامل کر کے مسلمان طبقے کی بے بسی کو زبان دی ہے، حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملک کا ایک بڑا طبقہ ایک ایسی جماعت کی غلامی کرنے پر مجبور ہے جو درحقیقت اس کی ہی جڑیں کاٹنے پر لگی ہوئی ہے، وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی آنے والی نسلوں کے لیے راستہ بند کر رہے ہیں، اپنے ہی ہاتھوں سے وہ اپنی اولاد کے لئے موت کو تجویز کر رہے ہیں۔

ذوقی نے اس موضوع پر بھی بات کی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو گائے سے بھی کمتر درجہ دیا جاتا ہے، ان کے لیے بے ہودہ الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے ایسے ملک میں وہ کیسے اپنا اچھا مستقبل دیکھ سکتے ہیں جہاں مسلمانوں کے خلاف محاذ کھولے جا رہے ہوں، مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی جا رہی ہوں، مسلمانوں کو تحفظ دینے کے لیے جب بی مشن نے ان کا استقبال کیا تو مسلمان یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اس جماعت کے کرتا دھرتا دراصل کس کے ہتھیار ے ہیں اور کس کے ایجنڈے کے تحت ہندوستان کے لیے یہ راہیں نکالی جا رہی ہیں اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں بی مشن جیسی جماعتوں کا نہ صرف حقیقی چہرہ سامنے آتا ہے بلکہ مسلمانوں کے جذبات کی بھی عکاسی ہو جاتی ہے۔

"جب روہنگیائی مسلمانوں کو نوبل انعام یافتہ حکمران کے اشاروں پر ملک بدر اور ہلاک کیا
جا رہا تھا ہمارے محافظ نے اس حکمران سے ملنے کے لیے یہی وقت مقرر کیا۔۔۔جب
اسرائیلی فتنہ فلسطین پر موت کے بارش کر رہا تھا، جب امریکی حکمران ٹرمپ مسلم ممالک
پر پابندیاں عائد کر رہا تھا، ہمارے محافظ حکمران ان۔۔۔ہمارے حکمران ہم سے انتقام
کی سیاست کر رہے ہیں۔" [۹۲]

ذوقی نے بے باکی سے تمام حقیقت کو بیان کیا ہے، ہندوستانی سیاست کا مکروہ چہرہ وہ سب کے سامنے لے آتے ہیں انہوں نے پورے ناول میں طنز کے نشتر چلائے ہیں اور ان کا صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کو جگایا جائے تا کہ وہ ان نام نہاد سیاسی جماعتوں کی حقیقت سے واقف ہو سکیں اور اپنا مقام حاصل کر سکیں جہاں انہیں زیادہ نہیں تو انسان کے طور پر تو قبول کیا جائے، جہاں پر ان کے اوپر آوازیں نہ کسی جائیں، جہاں انھیں مذہبی، سیاسی، معاشی اور ہر طرح کی آزادی حاصل ہو جو ایک آزاد شہری کا حق ہوتی ہے۔

ناول کے آخری حصے میں ذوقی اس ہولوکاسٹ "مرگ انبوہ" کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا نشانہ تاریخ میں

یہودی بن چکے ہیں اور ہندوراج کے تحت چلنے والی ہندوستانی حکومت مسلمانوں کے لئے بھی کچھ ایسے ہی جال بنتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

ناول میں ذوقی علامتی انداز میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے ان کی شناخت کے بدلے میں انہیں موت کے قریب کیا جا رہا ہے، ناول کی کہانی کے ذریعے ذوقی اس حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں ایک مختصر اقتباس ملاحظہ کریں۔

"صرف تین برس۔اور آپ کے لیے کچھ مہینے۔خفیہ افسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔
دس برسوں میں اس ملک کو آپ سے خالی کرنا ہے۔ملک میں خوشحالی آئے گی۔اور
آپ اپنے رب کے پاس ہوں گے۔" [۹۳]

اس اقتباس کے مطالعے سے بی مشن کے جیسی ہندو راشٹر تنظیموں کے مقاصد کا اندازہ ہو جاتا ہے ذوقی نے کھلے لفظوں میں اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ تاریخ خود کو پھر سے دہرانے کی طرف جا رہی ہے اگر مسلمانوں نے آنکھیں نہیں کھولیں تو ان کے ساتھ بھی یہ ہندوستان کا ہٹلر جادوگر وہی کرے گا جو یہودیوں کے ساتھ ہٹلر کر چکا۔

"مطلب صاف ہے، اب وہ صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ نشانے پر آپ ہیں۔
نازیوں نے جو سلوک یہودیوں کے ساتھ کیا، وہی سلوک آپ کے ساتھ ہونے
والا ہے۔" [۹۴]

ذوقی حالات کی سنگینی سے واقف ہیں اس ناول کے مطالعے کے بعد اندازہ لگانے میں کوئی تعامل نہیں ہوتا کہ آج آر۔ایس۔ایس اور بی۔جے۔پی نے پورے ہندوستان کو کیسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ایسے وقت میں مسلمانوں کا کوئی ساتھ دینے والا نہیں مگر ناول کے اختتام پر ایک جج کی زبانی ذوقی بی مشن کے کامیاب نہ ہونے کی نوعیت بھی سناتے ہیں کہ بے شک ہندوستان مکمل طور پر بی مشن کے انڈر ہے مگر امید ہے کہ وقت اپنا ارادہ بدلے گا اور انصاف ہوگا۔

ذوقی حقیقت پسند مصنف ہیں وہ جانتے ہیں کہ بی۔جے۔پی عصرِ حاضر کی ہندوستانی استعماری قوت ہے۔ فلم، سیاست، اسپورٹس ہر شعبہ پر اس کا قبضہ ہے مگر ظالم کے آگے سر جھکانے سے ظلم ختم نہیں ہو جاتا، بلی کے آتے ہی اگر کبوتر آنکھیں بند کر لے گا تو بلی ٹلے گی نہیں بلکہ بہادر بننا ہوگا ورنہ تاریخ میں ہم بھی ویسے ہی مٹ جائیں گے جیسے نازیوں نے یہودیوں کی نسل کشی کی تھی۔

ذوقی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اسی بدولت انہوں نے اس ناول میں ہٹلر کی نازی فوج کے ظلم وستم کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"۱۹۳۹ء کے آخر میں نازیوں نے بڑے پیمانے پر گیس چیمبر کا استعمال کیا۔ تجربات کے آغاز میں سب سے پہلے ذہنی مریضوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔۔۔اس کے بعد وسیع پیمانے پر گیس سے لیس گاڑیوں کا استعمال کیا گیا۔ ان میں بیشتر یہودی اور خانہ بدوش تھے۔" [۹۵]

لاکھوں یہودیوں کو دردناک موت دینے والے ہٹلر کی موت کا حال بھی ذوقی ناول کا حصہ بناتے ہیں جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ طاقت کے نشے میں اندھے انسان اصل میں کس قدر کمزور دل کے مالک ہوتے ہیں اور ساتھ میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک پیغام بھی کہ وقت کے سامنے سر نہیں جھکا دینا چاہئیے بلکہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے کیونکہ جیت ہمیشہ مقابلہ کرنے والوں کی ہوتی ہے۔

"ہٹلر ڈرپوک تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ خودکشی کر لی۔ موت سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے جسم کو جلا دیا جائے۔ ہٹلر کو اس بات کا احساس تھا کہ اگر اسے دفنایا گیا تو ہجوم اس کی لاش نکال کر بے دردی سے اس کے مردہ جسم کی بے حرمتی کرے گا۔" [۹۶]

ذوقی نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ جہاں ہندوستانی پولیس مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیتی وہیں وہاں کا میڈیا بھی خاموش تماشائی ہے جس نے ہڈی پھینک دی اس کے لیے دم ہلانی شروع کر دی، انہوں نے اس پر تنقید سے بھرپور جملے ادا کیے ہیں ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"غیر اردو اخبارات اور میڈیا کا رول شروع سے مسلم مخالف رہا ہے۔ فرضی انکاؤنٹر پر یہ میڈیا چیختا ہے مگر جب مسلمان بے قصور ثابت ہوتا ہے تو یہ میڈیا خاموش ہو جاتا ہے۔۔۔ ہندی اخبارات کے ساتھ سوشل ویب سائٹس اور میڈیا تک مسلمانوں کو دہشت گرد اور غدار ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔" [۹۷]

ان صفحات میں ذوقی نے خطرے کی نوعیت سنائی ہے کہ آزادی سے قبل ہندی اردو اخبارات انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے اب اردو اخبار مسلمانوں کے لیے مختص کر دیا گیا ہے اور ہندی اخبار ہندوؤں کے مقاصد کے لیے نکالے جاتے ہیں جس سے ظاہری طور پر یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ راہیں کہیں ایک بار پھر سے تقسیم کو نہ جنم دیں۔

ذوقی براہِ راست ہندوستانی میڈیا کو ٹارگٹ کرتے ہیں کہ اس تقسیم کی اور ایک دوسرے کے لیے زہر اگلنے کے لیے جو فضاء قائم کی گئی اس نے تقسیم جیسا ماحول پیدا کر دیا ہے، ایک طرف ذوقی ہندوستان کی سیاست کا گھناؤنا چہرہ دکھاتے ہیں وہیں پر وہ کرداروں کی زبان سے ان کی اصلیت بھی دکھاتے رہتے ہیں تا کہ قاری کو یہ گمان نہ ہو کہ ہندوستانی عوام بے خبر ہے اس حوالے سے ناول میں سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

"لیڈروں کی بات میں نہیں جانتی۔ ہر لیڈر اپنا سیاسی مفاد دیکھتا ہے۔ برسوں سے قوم کو فروخت کیا جا رہا ہے لیکن کیا آج سچ بولنے والے خاموش ہو گئے؟ یا مردہ ہو گئے تمہاری طرح۔" [۹۸]

اس میں وہ صرف ہندو یا غیر مسلم سیاستدانوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے بلکہ وہ مسلمانوں کی ضمیر فروشی کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔

"آتش رفتہ کا سراغ" میں ذوقی نے ایک اہم راز سے پردہ ہٹایا تھا کہ مسلمان دشمن عناصر اب مسلمانوں کا لبادہ پہن کر ہمارے اندر جگہ بناتے ہیں اور مسلمانوں کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں اس مکمل سسٹم کو وہ اپنے پچھلے ناول میں عیاں کر چکے ہیں یہاں پر بھی اس کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے اقتباس ملاحظہ کریں۔

"یہ موساد کے آدمی ہیں۔ موساد کے لیے کام کرتے ہیں اور ان میں سے کسی کے پاس پیسوں کی کمی نہیں۔۔۔ ان کو باضابطہ تربیت دی گئی ہے۔ اور وہ جھوٹا آدمی ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔" [۹۹]

موساد ایک اسرائیلی خفیہ ایجنسی ہے جس کے جاسوس پوری دنیا کے ممالک اور خاص طور پر مسلمان ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ذوقی نے بی مشن کا سہارا لے کر صرف آر۔ ایس۔ ایس اور بی۔ جے۔ پی پر ہی تنقید نہیں کی بلکہ وہ اور بھی مختلف نظریات کے حامل افراد کا پردہ چاک کرتے ہیں خاص طور پر مارکسی نظریات کی حامل جماعت سے منسلک مارکسسٹ جو وقت گزرنے کے ساتھ بہت کم تعداد میں رہ جاتے ہیں مگر بی مشن ان کو بھی نہیں بخشتی، ایک مسلمان کردار اس امید میں نظر آتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اُن کے حق میں لازمی آواز اٹھائے گی مگر وہاں بھی سب بک چکا ہوتا ہے، مسلمانوں کے لیے آواز اٹھانے والا مسلمانوں کے علاوہ کوئی بھی سامنے نہیں آتا سب اپنے مطلب کے لئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر جب مسلمانوں کے حق کی بات آتی ہے تب انہیں عزت دینے والا کوئی بھی سامنے نہیں آتا اس حوالے سے ایک کردار کا مکالمہ ملاحظہ کریں۔

"مجھے جادوگر کی ایک پرانی بات یاد آ رہی تھی۔تمام سیاسی پارٹیاں ہمارے ہی مشن
کا حصہ ہیں۔اب کامریڈ اتل سے یہ کہنے کا وقت نہیں تھا کہ آپ میں اور بی مشن
میں کیا فرق ہے۔" [۱۰۰]

یہ ناول غیر جانبداری کا منہ بولتا ثبوت ہے، ذوقی نے صرف مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ہی پردہ چاک نہیں کیا بلکہ ہندوستان میں رہنے والی اقلیتوں پر جس طرح کے مظالم کیے جاتے ہیں اُن کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔

"اڑیسہ میں غریب دلتوں کو جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا کچھ غنڈوں
نے انہیں زندہ جلا دیا۔خواتین کی عزت لوٹی۔۔۔بے شمار جلی ہوئی چیزوں کا ملبہ
بکھرا پڑا تھا، اس کے پیچھے وہی لوگ تھے۔۔۔ساڑھے تین سو گرجا گھروں اور
عبادات کے مقامات کو تباہ و برباد کیا گیا۔۔۔" [۱۰۱]

ان معلومات کو ناول کا حصہ بنا کر ذوقی نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی خطرے میں نہیں ہیں بلکہ وہاں قائم اور اقلیتوں کو بھی آہستہ آہستہ تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس ناول کو سیاست پر مبنی ناول نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ اس میں پورے ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے، ایک طرف تو ذوقی اس ناول میں سیاسی بحث و مباحثے کو شامل کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے جبکہ دوسری طرف وہ آج کی نوجوان نسل کو ناول کا موضوع بناتے ہیں پہلے باب میں انہوں نے نوجوان نسل کو پرکھا ہے، وہ نوجوان نسل جو پیزا برگر کے دور میں پیدا ہوئی ہے، مذہب سے کوسوں دور یہ نسل سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے نئے ایجاد ہونے والے کرشموں سے متاثر ہے اس نسل نے کامیابی اور آگے بڑھنے کے لئے مارک زکر برگ اور اسٹیو جابس کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا ہے، ایک ایسی نسل جس کو والدین کی ناراضگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا جن کے نزدیک کامیابی صرف پیسہ اور دولت اکٹھی کرنے کا دوسرا نام ہے۔

یہ نوجوان نسل خطرناک کھلونوں سے کھیلتی ہے انہیں وہ خطرناک گیم پسند ہیں جن میں راکٹ لانچر ہو، بم دھماکے ہوں، عمارتوں کو بموں سے اڑا دیا جائے، ان کے ہیروز بھی انہی جیسے ہوتے ہیں جو مارنا جانتے ہیں۔

ڈبلیو۔ڈبلیو۔ایف جیسے خطرناک کھیل اور کھلاڑی اس نسل کی دلچسپی کا مرکز ہوتے ہیں۔

ذوقی اس ناول میں عصرِ حاضر کے نوجوان کردار کے ذریعے ینگستان کی سوچ کی عکاسی کی ہے، اس جدید نوجوان نسل کی جو سرِ عام سیکس پر بات کرتی ہے، کھلے عام اس کے اظہار پر انہیں کس طرح کی شرمندگی نہیں ہوتی،

یہ نسل کچھ نیا کرنے کا عزم رکھتی ہے، اس میں ہارنے یا رُک جانے کا مادہ نہیں ہے۔
ذوقی نے ایک ایسی نوجوان نسل کو ناول کا حصہ بنایا ہے جو ہر طرح کے خوف سے بالاتر ہو کر سوچتی ہے، اس کے لیے ہر چیز اپنی کشش ختم کرتی جا رہی ہے یہاں تک کہ موت میں بھی اسے کشش نظر نہیں آتی۔
ذوقی کے ناولوں میں ایک قدر مشترک یہ بھی پائی جاتی ہے کہ تقریباً ہر ناول میں اولاد اپنے والدین سے خائف نظر آتی ہے جس کی مختلف وجوہات ہیں۔
زیرِ بحث ناول کا نوجوان کردار والد سے اس وجہ سے خوش نہیں ہو پاتا کیونکہ اس کی خواہشات پوری نہیں کی جا رہی ہوتیں اس حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> "ممکن ہے پہلی نسل والوں کے لئے جو ممنوعہ ہو، اس نسل نے اسے قبول کر دیا ہو۔۔۔ڈیڈ کی طرح ممی بھی اس نسل کو اور اس نسل کی خواہشوں کو نہیں جانتیں۔ یہاں values بدل گئے ہیں۔۔۔جیسے ڈیڈ کی کتابیں مجھے کبھی راس نہیں آئیں۔ ہاں اگر کتابیں کما کر دے سکتی ہوں تو آپ چیتن بھگ بنئے نا۔۔۔" [۱۰۲]

ذوقی نے اُس نوجوان نسل کو ناول کا حصہ بنایا ہے جو صرف اس بنا پر اپنے والدین سے نفرت کرتے ہیں کہ وہ انہیں اسائشات نہیں دے سکتے، اس حوالے سے ناول کے ایک نوجوان کردار ریمنڈ کے مکالمے دیکھے جا سکتے ہیں، ریمانڈ کے کردار کے ذریعے ذوقی نے قاری کی ایک نئے موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے۔
پچھلے چند سالوں میں کچھ ایسی ازیت ناک اموات نظر آئیں جن کے پیچھے ایک بلیو ویل نامی گیم تھی ذوقی نے ان حادثات کو قلمی شکل دے کر نوجوان نسل کی طرف اشارہ کیا ہے جو صرف لذت اور سسپنس کے لئے موت کو گلے لگانے سے بھی نہیں کتراتے، انہوں نے بلیو ویل نامی گیم کی مکمل تفصیلات کو ناول کا حصہ بنایا ہے کیونکہ ایسے واقعات میڈیا اور اخبارات کی زینت بن چکے ہیں اس لئے مصنف کے لیے اس کو سمجھنا اور کہانی میں ایک کردار کے ذریعے بیان کرنا کوئی زیادہ مشکل امر نہیں رہا ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ وہ نوجوان نسل کی تباہی پر افسردہ بھی نظر آتے ہیں۔
ذوقی نے ناول میں مارک زکر برگ اور اسٹیو جابس کے اقوال کا بھی استعمال کیا ہے جس سے ذوقی نئی نسل کی سوچ کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ اقوال ناول میں ایک خاص رنگ قائم کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔
ذوقی نے ناول میں تین نسلوں کا تقابلی جائزہ لیا ہے جہاں باپ کو روٹی چاول پسند ہیں تو بیٹے کو پیزا، برگر اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تبدیلی اب بڑوں میں بھی آتی جا رہی ہے آج والدین اولاد سے زیادہ پیزا، برگر کے شوقین نظر

آتے ہیں مصنف نے اس نئی تہذیب کی طرف اشارہ کیا ہے جہاں پڑھائی کتابوں سے سمٹ کر موبائل اور لیپ ٹاپ پر آ گئی ہے۔

ذوقی نے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا کہ نئی نسل نے خود کو حقیقت کے اتنے قریب کر لیا ہے کہ اس کے جذبات مر چکے ہیں اس کے لئے سب نارمل ہے، موت کے بارے میں نوجوان نسل کے نمائندے کے خیالات سنیں۔

"پھول مرجھا جاتے ہیں۔ چاند رات میں غائب ہو جاتا ہے۔ گھر پرانا ہو جاتا ہے۔ ایک دن کرکٹ کا بلا بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ فٹبال کی چمڑی پھٹ جاتی ہے اور انسان مر جاتا ہے۔ پھر انسان کے مرنے پر اتنا واویلا کیوں؟" [۱۰۳]

ذوقی نے ایسے نوجوانوں کی روداد بیان کی ہے جو اخلاقی اقدار اور خاندانی روایات کے قائل نہیں ہیں، ایک ایسی نوجوان نسل جو رومانس اور سیکس کی لذتوں سے دل بھر جانے کے بعد شدید قسم کے غصے اور تشدد کا شکار نظر آتی ہے۔

ذوقی نے نوجوان نسل کے مزاج کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے، ایک سچا فنکار مستقبل میں آنے والے خطرات سے واقف ہوتا ہے ذوقی کے اندر کا فنکار بھی حالات کی سنگینی سے واقف ہو گیا تھا جس کی مثال اس ناول کے قیام کی صورت میں سامنے آئی۔

ذوقی نے ایک ایسے ہندوستان کی تصویر کشی کی ہے جہاں ہٹلر کو آئیڈیل بنا کر مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے، ہندوستان میں بسنے والے عام مسلمانوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک حکومتِ وقت کی طرف سے روا رکھا جا رہا ہے اس کا دس فیصد بھی ہندوستانی میڈیا بیان نہیں کرتا ایسے میں ذوقی کا یہ ناول اُن تمام بے بس مسلمانوں کی آواز بن کر سامنے آیا ہے۔

"مرگ انبوہ" کے مطالعے سے ایک اہم بات جو میرے مطالعے میں آئی ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا سب سے زیادہ اثر ہندوستانی مسلمان پر ہوا ہے جس کو آج ستر دہائیوں کے بعد بھی پاکستان کا طعنہ دیا جاتا ہے، ۷۰ سال جمہوری ملک میں رہنے کے بعد آج ان سے ہندوستانی ہونے کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔

یونس خان اپنے تاثرات ان الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں۔

"یہ ایک ملک کے وہ خدوخال ہیں جہاں صرف چیونٹیاں ہیں، جادوگر ہے، بی مشن ہے، انکاؤنٹر ہیں، خفیہ محکمے کے لوگ ہیں جھوٹے مقدمے میں چاروں طرف منڈلاتی ہوئی موت ہے۔۔۔ مسلمانوں کو بیماری اور خوشحالی کے نام پر موت کو قبول کرنے کو کہا گیا ہے کہ وہ اپنے ہی موت کے پروانے پر خود دستخط کر دیں، یہی مرگِ انبوہ ہے۔" [۱۰۴]

مجموعی طور پر ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی مسائل اور تلخ حقائق کا دردناک بیانیہ "مرگ انبوہ" کا موضوع ہے۔

ذوقی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ انہوں نے یہ ناول لکھ کر ہندوستان کی بڑی سیاسی پارٹیوں کے راز فاش کر کے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے مگر اس سے وہ اپنے قومی فریضہ کو ادا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

"مرگ انبوہ" کا پلاٹ نہایت عمدہ ہے پلاٹ کی تشکیل کے حوالے سے ذوقی کا شمار کامیاب ناول نگاروں میں ہوتا ہے، زیرِ بحث ناول کا پلاٹ بھی بہت مربوط ہے ذوقی نے کہیں کہیں پیچیدگی کا سہارا بھی لیا ہے مگر انہوں نے کہانی کے تمام واقعات کو بہت خوبصورتی سے اصل مرکز کے ساتھ جوڑ دیا ہے، "مرگ انبوہ" کا پلاٹ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے تجربات کا احاطہ کرتا ہے ذوقی نے ہندوستانی سیاست کے گٹھ جوڑ کو بہت روانی سے ناول میں پیش کیا ہے۔

ناول کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے جن کو مندرجہ ذیل نام دیئے گئے ہیں۔

باب اول: موت سے مکالمہ (بلیو ویل اور پاشا مرزا)

باب دوم: جہانگیر مرزا کی ڈائری

باب سوم: موت سے سامنا

باب چہارم: مرگِ انبوہ

باب پنجم: نیند میں چلنے والے (پاشا مرزا کی کہانی کا آخری حصہ)

پہلے باب میں نوجوان نسل کی نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کی زندگی میں بلیو ویل جیسے خطرناک کھیل شامل ہو چکے ہیں۔

دوسرے باب میں ذوقی مرکزی کہانی کی طرف بڑھتے ہیں جہاں ایک بے بس، لاچار باپ اور ہندوستانی کی کہانی سامنے آتی ہے اس باب میں قاری کو زندگی کی فلاسفی سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ہندوستانی سیاست کا گھناؤنا چہرہ سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں اس مرگِ انبوہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کو دھکیلا جا رہا ہے۔

آخری باب میں ایک مسلمان کردار کی بے بسی دکھائی دیتی ہے یہ ناول کا سب سے مختصر باب ہے کیونکہ اس میں پوری کہانی کے نتائج بیان کئے گئے ہیں اور ہندوستان میں مسلم کمیونٹی کے لیے جو نسل کشی کا گڑھا کھودا جا رہا ہے۔

اس کی صداقت کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔

پورے ناول میں کردار اور واقعات اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ چلتے ہوئے نظر آتے ہیں ذوقی نے ناول کے تمام واقعات کو فنکارانہ اظہار کے ساتھ سمیٹ لیا ہے جس سے پلاٹ متاثر نہیں ہوتا، ذوقی نے تمام حقائق کو نہایت مہارت سے مگر کرخت لہجے میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے جس سے مصنف کے انداز میں غصہ اور ہمدردی دونوں عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں، ناول میں پے درپے موضوعات کو شامل کر کے ناول کو وسعت دی گئی ہے۔

"مرگ انبوہ" میں کرداروں کی ایک خاص تعداد دیکھنے کو ملتی ہے ذوقی نے مرکزی اور ضمنی دونوں طرح کے کرداروں کا استعمال کیا ہے مگر مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس ناول کے تمام کردار ہی ناول کے بنت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں ہم اگر کسی ایک بھی کردار کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دیکھتے ہیں تو اس سے ناول متاثر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

"مرگ انبوہ" ایک ہندوستانی کی کہانی ہے جو پیدا ہونے کے ساتھ اپنی شناخت میں مسلم لکھوا کر آیا اور یہی مسلمان ہونا اس کا سب سے بڑا جرم ثابت ہوا، یہ کہانی اس باپ کی ہے جس کا اکلوتا بیٹا اسے قابلِ نفرت سمجھتا رہا، اس باپ کی کہانی جو زندگی کے لئے جتن کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

جہانگیر مرزا جو کہ ایک آزاد خیال صحافی کا کردار ہے ذوقی نے اس کردار کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا تذکرہ کیا ہے۔

اس کردار کو زندہ کردار کہا جا سکتا ہے کیونکہ اپنی موت کا پروانہ ہاتھ میں آنے کے باوجود بھی وہ سر نہیں جھکاتا بلکہ اپنے موقف پہ ڈٹا رہتا ہے۔

جہانگیر مرزا کا کردار ایک مثبت کردار ہے جو وقت کے بدلنے کی رفتار سے واقف ہے اور وقت کے ساتھ اپنی زندگی کو رُوکنے والا نہیں ہے، نئی نسل کی آئیڈیالوجی کو پسند کرنے لگتا ہے، کسی چوردروازے سے وہ اپنے جوان بیٹے جیسا بننے کی خواہش کرتا ہے۔

ذوقی دونسلوں کا تقابلی جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "پندرہ ہزار کی جینز اور ایک بلیڈ_ تم میں ہمت ہے تمہاری نسل میں_ تم ہمیں سکھاتے ہو کہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو اپنے پسندیدہ برانڈیڈ لباس کی دھجیاں بکھیر سکتے ہو۔۔۔اور مجھے یہی بات تمہاری پسند ہے_ ہم جذباتی ہوتے تھے_ مورکھ ...اور ایک دن یہی مورکھتا ہمیں پریشان کرنے لگتی تھی۔" [۱۰۵]

جہانگیر مرزا ایک مہذب اور اخلاقیات کا پابند انسان تھا مگر وہ ادبی محفلوں اور سیمیناروں میں ادبی حد سے تجاوز کر

جاتا یہاں پر ذوقی کا اپنا کردار اس کردار میں جھلکتا ہے اس کی وضاحت ذوقی نے جہانگیر مرزا کی زبانی کی ملاحظہ کریں۔

"زندگی ہی نہیں سیکھ پایا تو برداشت کرنا، کہاں سے سیکھوں۔کم بخت زندگی کا ہر موڑ مشکل ہے۔کہاں لے جائے گی، کچھ پتہ نہیں ہوتا... مگر سیاست۔یہاں دلال پیدا ہو گئے ہیں۔اور میں خود کو روک نہیں پاتا۔" [۱۰۶]

ہندوستان کے ہندوراج میں مسلمانوں کے لیے معاشی حالات تنگی کی طرف سفر کر رہے ہیں ایسے ہی جہانگیر مرزا بھی مجبوری کے تحت ہندوراج پارٹی بی مشن میں شامل تو ہو جاتا ہے مگر وہ اپنی آئیڈیالوجی کا سودا نہیں کر پاتا وہ ایک آزاد ذہن انسان تھا جسے بی مشن غلام نہ بنا سکا، مجبوری کے تحت بھی وہ منافقت نہ سیکھ سکا اور ضمیر کی آواز اسے ہمیشہ ستاتی رہی۔

"میں کیا تھا؟ بہروپیا، مسخرہ یا غلام۔میں تاریخ کی الٹی سمت بہہ رہا تھا۔سچ کو غلط، ناجائز کو جائز کہہ رہا تھا۔میں سچ اور حقیقت کی دنیا پر پردہ ڈال رہا تھا اور یہ میرے حصے کا کام تھا جو مجھے پوری ایمانداری سے کرنا تھا۔ہم کچھ لوگوں کو قبرستان بھیج رہے تھے۔کچھ کو پاکستان۔ کچھ کو غدار ٹھہرا رہے تھے۔" [۱۰۷]

جہانگیر مرزا ضمیر فروش نہیں تھا اس لئے تو وہ زیادہ عرصہ اس گھناؤنی سازش کا حصہ نہ بن سکا اور موت کو قبول کرنا اس ذلت کی زندگی سے بہتر سمجھا۔

جہانگیر مرزا کے کردار میں ہمیں کہیں نہ کہیں مشرف عالم ذوقی کا اپنا چہرہ بھی نظر آتا ہے یہ کردار بھی وطن سے ویسی ہی محبت رکھتا ہے جیسی ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔

جہانگیر مرزا کے کردار کے ذریعے سے ذوقی نے بی۔جے۔پی اور آر۔ایس۔ایس جیسی ہندو پارٹیوں کے مشن کی وضاحت کی ہے اور فاشزم کے خلاف آواز بلند کی ہے، ہندوستان کی تہذیب کو کس طرح نقصان پہنچایا تمام عوامل اس کردار کی زبانی ناول میں موجود ہیں۔

جہانگیر مرزا کے پسِ پشت مشرف عالم ذوقی ہندوستان کے مستقبل کے لیے فکرمند نظر آتے ہیں۔

"میں نے ایک سفید کاغذ اٹھایا۔ماچس کی تیلی جلائی۔کاغذ سے دھواں اٹھنے لگا۔میں نے کچھ دیر تک دھویں پر آنکھیں مرکوز رکھیں۔کیا یہ ہم ہیں؟ ہماری آئیڈیالوجی۔یا سلگتا ہوا ملک ہے ہمارا؟" [۱۰۸]

جہانگیر مرزا ایک ایسے باپ کا کردار ہے جو اپنی موت کے ساتھ ساتھ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے پروانے پر

بھی خود دستخط کرتا ہے، یہ ایک ہندوستانی باپ کی کہانی ہے اس کردار کے ذریعے ذوقی نے ہندوستان کے ہر اس انسان کی کہانی بیان کی ہے جو موجودہ حکومت کے ظلم وستم کا شکار ہے۔

جہانگیر مرزا اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو ان حالات سے دور رکھتا ہے، جو کچھ اس کے ساتھ گزرتا رہا وہ اُسے ڈائری کی شکل میں محفوظ کر کے اپنی موت کے بعد بیٹے کے لیے چھوڑ گیا۔

پاشا مرزا ناول کا دوسرا اہم کردار ہے جو اپنے باپ کی ڈائری کے ذریعے ناول کو آگے بڑھاتا ہے، پاشا مرزا اس ینگستان کا نمائندہ ہے جہاں تمام اقتدار پامال ہو چکی ہیں، ناول کا داستان گو ہونے کے ناطے ابتداء سے اختتام تک یہ کردار موجود رہتا ہے۔

پاشا مرزا کے سامنے نوجوان نسل کے نمائندے مارک زکر برگ اور اسٹیو جابس مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کردار اپنے باپ کی ڈائری میں کھو جاتا ہے جہاں اسے ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔

پاشا مرزا کے کردار کے ذریعے ذوقی نے نوجوان نسل کے خیالات کی عکاسی ہے جہاں یہ کردار اپنی زبانی نوجوان نسل کی تباہی کے محرکات بیان کرتا ہے۔

پاشا مرزا ساری زندگی اپنے باپ سے نفرت کا اظہار کرتا رہا مگر جب وہ ڈائری کے ذریعے حقیقت سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے خیالات تبدیل ہو جاتے ہیں ذوقی نے نوجوان نسل کو اس کی اچھائیوں اور برائیوں دونوں کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ نوجوان نسل اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کا ہنر جانتی ہے ایسے ہی پاشا مرزا کے اندر کا نوجوان بھی اپنے خیالات کو تبدیل کر لیتا ہے، ڈائری پڑھنے کے بعد وہ اپنے باپ کی موت کا سبب جانتا ہے اس کی تحقیق کرتا ہے کیونکہ نوجوان نسل ثبوت کے بغیر کسی چیز پر یقین نہیں کرتی ایسے میں پاشا مرزا بی مشن کے لوگوں سے ملتا ہے جس کے بارے میں وہ اپنے باپ جہانگیر مرزا کی ڈائری میں پڑھ چکا ہوتا ہے مگر پاشا مرزا میں خوف نہیں نظر آتا وہ بے باک ہوتا ہے، اپنے باپ کی موت پر سوال اٹھاتا ہے اس موت کے فرمان کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا باپ نیند میں چلنے والوں میں سے نہیں تھا، اس کا باپ ایک عظیم انسان تھا جس نے ان فسطائی طاقتوں کے ساتھ اختلاف کیا، یہ سب جاننے پر اس کی والد سے نفرت کو محبت میں بدلنے میں وقت نہیں لگتا۔

> "میں فطرت کے سحر میں کھو کر سب کچھ بھول جانا ہے چاہتا تھا۔۔۔ بلیو ویل کا شکار کرنے والے سرخ چیونٹیوں سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ مجھے ڈیڈ پر پیار آ رہا تھا اور کچھ لمحات سکون کے ساتھ میں ڈیڈ کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔" [۱۰۹]

اس کردار کے ذریعے ذوقی نے ایلومناتی فرقہ کو ناول میں بیان کیا ہے اور خاص طور پر نوجوان نسل کس تیزی سے ایک شیطان کی پرستش کرنے والے فرقے میں دلچسپی لے رہی ہے اس کی وضاحت کی ہے جس کی مثال بلیو ویل گیم کے ذریعے دی جاتی ہے۔

ایک اور کردار ناول میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوتا ہے، یہ کردار کچھ ہی حصے میں شامل ہوتا ہے، اس کردار کے ذریعے ذوقی نے ایک بے بس ہندوستانی مسلمان کی تصویر کشی کی ہے۔

سبحان علی یومِ جمہوریہ پر پرچم کشائی کر کے ان تمام لوگوں کے منہ بند کرنا چاہتا تھا جن کے نزدیک مسلمان دہشتگرد اور وطن کے لئے نقصانات کا سبب ہیں مگر اس کی بدقسمتی کہ وہ محبت کا اظہار اس کی جان لے لیتا ہے اس پر بچہ چوری کا الزام لگا کر کھلے عام مار دیا جاتا ہے اس کی بیٹی کو اغوا کر کے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس کے جزبے کو بھی آخر کار موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

ذوقی نے اس کردار کے ذریعے ہندوستانی پولیس کا مکروہ چہرہ سب کو دکھایا ہے جو اپنے ہاتھوں سے ہی ظالم کے خلاف ثبوت مٹا دیتی ہے، بڑے پیمانے پر ہونے والے احتجاج سے بھی ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، سبحان علی جیسے لوگ اپنی بیٹیوں کی عزتیں گنوا کر انصاف کے طلبگار ہیں مگر اُن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں پر کوئی ہاتھ ڈالنے کا نہیں سوچ سکتا کیونکہ ان کو اس مقام پر لے کے آنے والے بھی وہی لوگ ہیں جو ملک کے ٹھیکیدار بنے پھرتے ہیں۔

سبحان علی کے کردار میں غصہ نظر آتا ہے، بے بسی نظر آتی ہے اور سب سے زیادہ خوف، چیونٹیوں کا خوف جو راتوں رات ہنستے بستے گھر اجاڑ دیا کرتی ہیں اور بالآخر سبحان علی کا گھر بھی اُن بے قصور لوگوں کے گھروں کی طرح غائب ہو گیا جو سرخ چیونٹیوں کا شکار بنے۔

"ساری طاقت، سارا روزگار ہمارے ملک کی معاشیات سب بی مشن کے پاس ہے
اور اسی لیے ہم جیسے فری لانسر رات کو آوارہ سڑکوں پر چلانے والے کتے بن گئے
ہیں اور ان کتوں کے نصیب میں چوسی ہوئی ہڈی بھی نہیں ہے۔" [۱۱۰]

ذوقی کے کردار خیالی نہیں ہیں، ان سب کرداروں کا اور واقعات کا تعلق کسی نہ کسی حقیقت سے جڑا ہوا ہے۔

نسوانی کرداروں میں ایک ہی کردار جاندار نظر آتا ہے جو سارہ جہانگیر کا کردار ہے یہ ایک متوازن ذہن کی خاتون کا کردار ہے، ایک ایسی ماں کا کردار جو اپنے بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت کم کرنا چاہتی ہے اور اس نفرت میں چھپی محبت کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

یہ کردار ایک وفا شعار بیوی کا کردار ہے جو اپنے شوہر کی ناکام زندگی میں بھی اس سے شکوہ نہیں کرتی، ایک اچھی بیوی کا کردار ہے جو ایک اچھی ماں بھی ثابت ہوتی ہے، اپنے شوہر کے بارے میں وہ جن خیالات کا اظہار اپنے بیٹے کے سامنے کرتی ہے قابل تعریف ہیں۔

"میں کہہ سکتی ہوں وہ ایک معصوم مرد تھا۔ایک بے حد پیار کرنے والا باپ بھی مگر وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں سے واقف تھا۔وہ جانتا تھا، وہ اپنے بیٹے کو وہ سب کچھ نہیں دے سکتا، جس کی اس کو ضرورت ہے۔۔۔یا اس کے مرجانے پر اس پر الزاموں کی بارش نہیں کرسکتے۔۔۔وہ دوسروں سے الگ تھا۔۔" [۱۱۱]

"بار بار مسلمانوں سے یہ صفائی مانگی جاتی ہے کہ وہ محبِّ وطن ہونے کا ثبوت پیش کریں اور ثبوت کے طور پر دادری میں رہنے والے محمد اخلاق کے فریزر میں مٹن، بیف بن جاتا ہے۔المیہ... المیہ کہ اپنی حد میں رہنے والے قانون کا پاس رکھنے والے محمد اخلاق کے فریزر میں رکھے مٹن کو عدلیہ بھی بیف ثابت کرنے پر تل جاتی ہے۔" [۱۱۲]

ذوقی کے ان الفاظ کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حقیقی واقعات سے ناول کی کہانی کو مرتب کیا ہے، یہ کردار درحقیقت روزمرہ سے لیے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ناول کا مطالعہ کرنے پر ہر ہندوستانی کو ان کے کرداروں میں اپنا وجود چلتا پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مجموعی طور پر کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں زبردست رئیلٹی کا استعمال کیا گیا ہے، اسی رئیلٹی نے کرداروں میں جان بھر دی ہے جس وجہ سے یہ کردار تاریخی کردار بنتے نظر آرہے ہیں۔

ناول کے اہم اجزا میں ایک مرقع نگاری بھی شامل ہے ذوقی نے اپنے تمام ناولوں میں اس صنف کا استعمال کثرت سے کیا ہے مگر "مرگ انبوہ" میں وہ جس فکر پر بات کرتے ہیں اس میں اتنے کھو جاتے ہیں کہ فنی لوازمات کی طرف کم توجہ دے پائے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں مرقع نگاری قدرے کم نظر آتی ہے۔

کرداروں کے مذاہب کے مطابق ذوقی نے ان کی تصویر کشی کی ہے جس سے ناول میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے، ہندو کرداروں کے لباس اور مسلمان کرداروں کا حلیہ مختلف ہوتا ہے ذوقی نے بھی اس فرق کا استعمال کیا ہے جس کے نمونے مندرجہ ذیل ہیں۔

"شاستری جی دبلے پتلے آدمی تھے۔قد زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ ۱۳ انچ ہوگا۔اس وقت وہ سفید دھوتی اور کُرتے میں تھے۔" [۱۱۳]

مسلمان کرداروں کا مرقع ہو بہو ایسے بیان کیا ہے جس سے اس کی شخصیت کی بھی نمائندگی ہو جاتی ہے۔

"اس زمانے میں میرے والد اسلم مرزا حیات تھے۔ وہ کم بولتے تھے۔ چہرہ روشن اور کتابی۔ سفید داڑھی۔ اجلا شفاف کرتا پاجامہ پہنتے تھے اور پانچوں وقت کے نمازی تھے۔ تہجد اور چاشت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی تھی۔" [۱۱۴]

"بزرگ شخص کے بال سفید تھے۔ داڑھی بھی سفید تھی۔ ان کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا۔ انہوں نے سفید کرتا اور پائجامہ پہن رکھا تھا۔" [۱۱۵]

ناول میں منظر نگاری کو مکمل مہارت سے بیان کیا جائے تو ناول کی کہانی میں نئے سرے سے جان آ جاتی ہے ، کامیاب منظر نگاری وہی ہوتی ہے جس میں ناول نگار منظر کو قاری کی آنکھوں کے سامنے عیاں کر دے۔
ناول نگار کو چاہیے کہ وہ تمام مناظر کو اس انداز سے بیان کرے کہ پڑھنے والے کے سامنے تصور قائم ہو جائے۔
ذوقی کے ناولوں میں منظر نگاری کے اعلی نمونے دیکھنے کو آتے ہیں۔ "مرگ انبوہ" میں بھی انہوں نے اس صنف کی بہترین تصویر پیش کی ہے مثالیں ان اقتباسات کی صورت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

"بادامی رنگ کی دیواریں۔ ایک جگہ اسکول میں ملے ہوئے ایوارڈ اور تمغے سجے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹا سا بیڈ تھا۔۔۔ ایک میز ایک کرسی۔ دوسری طرف میرے چار پانچ جوتے زمین پر قرینے سے رکھے تھے دیوار پر ڈبلیو۔ڈبلیو۔ایف کے کھلاڑیوں کی دو پینٹنگ تھیں۔" [۱۱٦]

"ایک بڑا سا گھر۔ گھر کے باہر جھولتا ایک پردہ۔ ٹوٹی دیواریں۔ اس دروازے اور دیواروں کے درمیان ایک بند سی دنیا آباد تھی۔" [۱۱۷]

مندرجہ بالا اقتباس کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ذوقی نے کس خوبصورتی سے ایک عہد کی عکاسی ان مناظر میں بیان کی ہے کیونکہ بڑا گھر اور دروازے پر لٹکتا ہوا پردہ برسوں پہلے کی تہذیب کی یاد تازہ کرتا ہے اس کے مدِ مقابل آج کے عہد کہ عکاسی مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعے ہو جاتی ہے ملاحظہ کریں۔

" کمرے میں داخل ہوتے ہیں ڈرائنگ روم تھا۔ کافی کشادہ۔ ایک طرف کچھ اسلامی پینٹنگس لگی تھیں۔ صوفے قیمتی تھے۔" [۱۱۸]

"مرگ انبوہ" میں منظر نگاری بھی کم کی گئی ہے مگر جتنی کی گئی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔
مکالمہ نگاری کو بھی ناول کا اہم جز تصور کیا جاتا ہے کیونکہ مکالمہ ہی وہ صنف ہے جس سے کرداروں کی خصوصیات اور ان کے مخصوصات کو اجاگر کیا جا سکتا ہے اور اس سے پلاٹ کے ارتقاء میں بھی کامیابی ملتی ہے یہ ناول نگار پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کرداروں سے کیسے امور ادا کروانا چاہتا ہے اور کرواتا ہے۔

ذوقی کے ناولوں میں مکالمہ ناول کی روح کا کردار ادا کرتے ہیں وہ مکالموں کا صحیح اور برمحل استعمال کرتے ہیں جس سے ناول میں روانی پیدا ہوتی ہے، زیرِ بحث ناول میں مختصر مکالمات کا سہارا لیا گیا ہے جس سے قاری ناول کی طرف متوجہ رہتا ہے اور مکالموں کی برجستگی سے ناول کی دلکشی میں بھی اضافہ ہوا ہے، ذوقی نے مکالمے کا کم استعمال کیا ہے مگر جہاں کیا ہے وہاں مکالمے اس انداز میں رچ بس گئے ہیں کہ ان کو وہاں سے الگ کرنا محال تصور کیا جائے گا۔

"مرگ انبوہ" کا موضوع ایسا ہے کہ اکثر کرداروں کی زبان سے تلخی جھلکتی نظر آتی ہے اور بے بسی سے ملتے جلتے اکثر مکالمہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

> "شاستری کی آواز زہر میں ڈوبی تھی۔ جب میانمار جل رہا تھا۔ آنگ سانگ سو چی تشدد کو لے کر جشن منا رہی تھی۔ آج ۲۶ جنوری ہے۔ کچھ مسلمانوں کو ہلاک کر کے بی مشن جشن کا انتظام کر رہی ہے۔" [۱۱۹]

ذوقی نے کرداروں کی زبان سے ان کے ماحول کے مطابق مکالموں کو ادا کیا ہے جس سے ناول میں مقامی رنگ نظر آتا ہے جس سے تحریروں کو مزید خوبصورت بنانے میں انہیں کامیابی ہوئی ہے۔

ناول کی کامیابی کا انحصار جہاں موضوعات پر ہوتا ہے وہیں زبان و بیان بھی خاص اہمیت کی حامل ہے، موضوع اگر دلکش نہ بھی ہو تب بھی اگر اس کو پیش کرنے کا ڈھنگ اور سلیقہ عمدہ ہو تو ناول کامیاب تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ اگر ناول کا اسلوب جاندار ہوگا تو قاری کی دلچسپی برقرار رہے گی۔

ذوقی نے زیرِ بحث ناول میں دلکش پیرا گراف اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے اور تشبیہات و استعاروں کی زبان استعمال کی گئی ہے۔

درحقیقت "مرگ انبوہ" ایک علامتی ناول ہے ذوقی نے پے در پے علامات کا استعمال کیا ہے کیونکہ اگر وہ براہِ راست اشخاص اور اداروں کو ٹارگٹ کرتے تو یہ ناول کم اور کوئی اخباری رپورٹ زیادہ گمان کی جاتی اس لیے انہوں نے علامتی اندازِ تحریر اپنا کر اس ناول کو حقیقت نگاری کی ایک مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔

ایک علامت جادوگر کے استعمال کی گئی ہے جس کو سمجھنے کے لئے مرگِ انبوہ کا مفصل مطالعہ ضروری ہے، جادوگر جو اپنی جادوگری سے پورے ملک کو تبدیل کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ انہونی کو ہونی بنا دیتا ہے، اس کے نزدیک سب اس کے غلام ہیں اور درحقیقت یہی دیکھنے میں بھی آتا ہے کہ جادوگر ناول کا سب سے زیادہ قابلِ نفرین کردار ہے مگر لوگ جانتے بوجھتے ہوئے اس کے سحر سے جڑے ہوتے ہیں۔

جادوگر غائب ہوتا ہے مگر غائب ہوتے ہوئے بھی وہ ہر جگہ نظر آ رہا ہوتا ہے اس کی جادوگری ہر جگہ نظر آ رہی ہوتی ہے۔

ذوقی نے اس جادوگر کے ذریعے راتوں رات تین سو ستر چنار کے پیڑ کاٹنے، پینتیس جھیلوں کو برباد کرنے کا واقعہ اور ہزاروں لوگوں کو برباد کرنے کا احوال بیان کیا ہے جس پر آج تک کسی نے لکھنے کی جرات نہیں کی مگر ذوقی نے اس پورے سسٹم کو بے نقاب کیا ہے، بی مشن کے لفظ کے پسِ پردہ جو حقائق انہوں نے بیان کئے ہیں یہ ایک تاریخی معرکے سے کم نہیں۔

ذوقی نے اس ناول میں مختلف تکنیک کا استعمال کیا ہے جن کے امتزاج سے ناول کو چار چاند لگا دیے ہیں، انہوں نے بیانیہ اندازِ تحریر اپنایا ہے جبکہ کہانی کی روانی میں ڈائری کی تکنیک استعمال کی گئی ہے، کہیں کہیں خود کلامی بھی نظر آتی ہے جو زیادہ تر کہانی کے راوی اور مرکزی کردار پاشا مرزا کی زبانی بیان کی گئی ہے جبکہ زیادہ تر مخاطبانہ اندازِ تحریر اپنایا گیا ہے جس میں سسپنس کے ملے جلے تعصرات بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

ذوقی نے ہیلوسینیشن کی تیکنیک کا پہلی بار تجربہ کیا جس میں انہیں خاطرِ خواہ کامیابی نصیب ہوئی جبکہ شعور کی رو کی جھلکیاں بھی دیکھنے میں ملتی ہیں جسے عمدگی کے ساتھ انہوں نے ناول کے متوازن ہونے کے لئے میں استعمال لایا ہے۔

ناول کے اختتام پر مرکزی کردار کی بیماری کے حوالے سے جو حقائق سامنے آتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذوقی نے وہم کی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔

ذوقی نے ناول میں اشعار کو بھی ایک دو جگہوں پر استعمال کیا ہے جن میں ایک فارسی شعر مولانا روم کا لکھتے ہیں ملاحظہ کریں۔

"سینا خواہم شرح شرح از فراق

تا بگویم شرح دردِ اشتیاق" [۱۲۰]

(اے خدا! میں اپنا سینہ آپ کی جدائی کے غم میں ٹکڑے ٹکڑے چاہتا ہوں تا کہ آپ کی محبت کے دردِ اشتیاق کی شرح کو بیان کرسکوں۔)

ذوقی کے ناولوں میں اشعار کا استعمال اکثر دیکھنے میں آتا ہے مگر اس سے پہلے وہ اردو اشعار کو ناولوں میں استعمال کیا کرتے تھے "مرگ انبوہ" میں انہوں نے مولانا روم کے اس شعر کا استعمال کیا ہے جس سے ان کا فارسی شاعری سے لگاؤ اور فارسی شعرا میں دلچسپی ہونے کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

چوتھے باب کی شروعات کیدارناتھ سنگھ کے مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعے کی ہے۔

"میں پوری طاقت کے ساتھ
لفظوں کو پھینکنا چاہتا ہوں آدمی کی طرف
یہ جانتے ہوئے بھی کہ آدمی کا کچھ نہیں ہوگا۔۔۔
یہ جانتے ہوئے بھی کہ لکھنے سے کچھ نہیں ہوگا
میں لکھنا چاہتا ہوں... " [۱۲۱]

اقبال کا ایک شعر لکھتے ہیں۔

"دشت تو دشت ہیں دریا بھی نا چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے" [۱۲۲]

ذوقی نے ان اشعار کا برجستہ استعمال کر کے ناول میں شعریت کے تحت خوبصورتی لانے کی کوشش کی ہے۔

ذوقی نے ناول کے اسلوبِ بیان میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ناول میں رنگ بھر دیتا ہے۔

" لیکن ویئر یورایٹی چیوڈ (where your attitude) والا لہجہ دادا کو
ہضم نہیں ہوتا تھا اور پوتے کے we are like this only یعنی ہم تو
ایسے ہی ہیں۔۔۔" [۱۲۳]

"A silent house wake me up 4.20 A.M, A sea
of wheles." [۱۲۴]

پورے ناول کا اسلوب اپنے اندر جاذبیت اور دلکشی سموئے ہوئے ہیں، خوبصورت لفظوں کے ساتھ سے اسلوب منفرد اور دلچسپ بن گیا ہے۔ ذوقی نے سادہ اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے جس سے مقامی آبادی کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے مجموعی طور پر مرگِ انبوہ کا اسلوب جدید اسلوب کے تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔

"مرگ انبوہ" ذوقی کو عصرِ حاضر کے نمایاں ناول نگاروں کی صف میں اول درجہ عطا کرتا ہے اس ناول میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی آگاہی دی گئی ہے یہ تبدیل ہوتے ہندوستان کی سچی تصویر ہے، ایک قوم کو کیسے منظر سے ہٹایا جا رہا ہے جس پر سیاست نے بھی اپنا رخ موڑ لیا ہے، ذوقی نے اس ناول کے ذریعے مستقبل میں پیش آنے والے بدترین حالات کی پیشگوئی کی ہے انہوں نے اس ناول کے ذریعے موجودہ اور آئندہ کی ہندوستانی سیاست اور واقعات و سانحات کو مستقبل کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

"مرگ انبوہ" کے بعد مشرف عالم ذوقی اس سلسلے کی اگلی تین کڑیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

دوسرا حصہ "مردہ خانہ میں عورت" تیسرا حصہ "ہائی وے پر کھڑا آدمی" اور آخری حصہ کو انہوں نے" دشت لا یعنی" کا نام دیا جو فلحال زیر طبع ہیں۔
یہ ناول فسطائی طاقتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔
امید کرتی ہوں کہ ان کے یہ تینوں حصے بھی "مرگِ انبوہ" کی طرح جاندار ہوں گے اور جیسے مرگِ انبوہ نے اردو ناول کی تاریخ میں اپنی الگ شناخت بنائی ہے وہیں یہ حصے بھی کامیابی کے قدم چومیں گے۔

حوالہ جات

۱ ۔ مشرف عالم ذوقی، آتشِ رفتہ کا سراغ، ساشا پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۳
۲ ۔ ایضاً، ص:۶۴۵
۳ ۔ ایضاً، ص:۸۸
۴ ۔ ایضاً، ص:۶۰۶
۵ ۔ ایضاً، ص:۲۱۴
۶ ۔ ایضاً، ص:۳۳۵
۷ ۔ ایضاً، ص:۳۷۵
۸ ۔ ایضاً، ص:۵۲۱
۹ ۔ ایضاً، ص:۵۲۵
۱۰ ۔ ایضاً، ص:۲۰
۱۱ ۔ ایضاً، ص:۵۶۳
۱۲ ۔ ایضاً، ص:۵۶۵
۱۳ ۔ ایضاً، ص:۶۱۹
۱۴ ۔ ایضاً، ص:۶۲۴
۱۵ ۔ ایضاً، ص:۵۹۲
۱۶ ۔ ایضاً، ص:۵۹۲
۱۷ ۔ ایضاً، ص:۶۹۹
۱۸ ۔ ایضاً، ص:۷۰۰
۱۹ ۔ ایضاً، ص:۷۰۰
۲۰ ۔ ایضاً، ص:۲۰۵
۲۱ ۔ ایضاً، ص:۳۵۷
۲۲ ۔ ایضاً، ص:۴۲۴

۲۳ ۔ ایضاً،ص:۵۹۵

۲۴ ۔ ایضاً،ص:۳۵

۲۵ ۔ ایضاً،ص:۲۸۱

۲۶ ۔ ایضاً،ص:۶۹۵

۲۷ ۔ ایضاً،ص:۳۳۶

۲۸ ۔ ایضاً،ص:۳۷۰

۲۹ ۔ ایضاً،ص:۴۶۳

۳۰ ۔ ایضاً،ص:۱۵۰

۳۱ ۔ ایضاً،ص:۳۴۴

۳۲ ۔ ایضاً،ص:۱۱۸

۳۳ ۔ ایضاً،ص:۳۰

۳۴ ۔ ایضاً،ص:۱۵۹

۳۵ ۔ ایضاً،ص:۱۹۲

۳۶ ۔ ایضاً،ص:۳۳۱

۳۷ ۔ ایضاً،ص:۳۳۱

۳۸ ۔ ایضاً،ص:۳۷۲

۳۹ ۔ ایضاً،ص:۴۶۴

۴۰ ۔ ایضاً،ص:۱۰۹

۴۱ ۔ ایضاً،ص:۱۱۲

۴۲ ۔ ایضاً،ص:۲۶۳ (ایک طویل نظم جسے اقتباس میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔)

۴۳ ۔ ایضاً،ص:۳۷۲

۴۴ ۔ ایضاً،ص:۴۶۴

۴۵ ۔ ایضاً،ص:۷۰۱

۴۶ ۔ ایضاً،ص:۶۷۰

۴۷ ۔ ایضاً،ص:۳۴۵

۴۸ ۔ مشرف عالم ذوقی، نالۂ شبِ گیر، ذوقی پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء،ص:۱۲

۴۹ ۔ ایضاً،ص:۳۵۱

۵۰ ۔ عمران عاکف خان، ادبی گوشہ، روزنامہ متاعِ آخرت کانپور، ۱۷اگست ۲۰۱۴ء، اتوار،ص:۸

۵۱ ۔ احمد جاوید، نالۂ شبِ گیر: ایک قاری کے تاثرات، روزنامہ متاعِ آخرت کانپور، ۶ مارچ ۲۰۱۶ء، اتوار،ص:۸

۵۲ ۔ سیمی کرن، نالۂ شبِ گیر ایک ضروری مکالمہ عورتوں کے تعلق سے، روزنامہ متاعِ آخرت کانپور، ۳ جنوری ۲۰۱۶ء، اتوار ص:۸

۵۳ ۔ مشرف عالم ذوقی، نالۂ شبِ گیر، ذوقی پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء،ص:۱۵۷

۵۴ ۔ ایضاً،ص:۶۰

۵۵ ۔ ایضاً،ص:۸۲

۵۶ ۔ ایضاً،ص:۱۹۹

۵۷ ۔ ایضاً،ص:۱۱۹

۵۸ ۔ ایضاً،ص:۳۱۵

۵۹ ۔ ایضاً،ص: ۱۴۸

۶۰ ۔ ایضاً،ص:۶۰

۶۱ ۔ ایضاً،ص:۸۲

۶۲ ۔ ایضاً،ص:۱۰۷

۶۳ ۔ ایضاً،ص:۱۰۳

۶۴ ۔ ایضاً،ص:۴۷

۶۵ ۔ ایضاً،ص:۴۸

۶۶ ۔ شموئل احمد، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء،ص:۵۳

۶۷ ۔ مشرف عالم ذوقی، نالۂ شبِ گیر، ذوقی پبلیکشرز، دہلی، ۲۰۱۵ء،ص:۲۲۲

۶۸ ۔ ایضاً،ص:۱۶۱

۶۹ ۔ ایضاً،ص:۱۵۸

۷۰ ۔ ایضاً،ص:۲۴۰

۷۱ ۔ ایضاً،ص:۲۲۵

۷۲ ۔ ایضاً،ص:۳۳۵

۷۳ ۔ ایضاً،ص:۳۴۸

۷۴ ۔ ڈاکٹر ذاکر فیضی،مشرف عالم ذوقی اور ناول مرگِ انبوہ' قومی تنظیم، پٹنا،۲۰۲۰ء، مارچ ۲۳،سوموار،
ص: ۱۰

۷۵ ۔ مشرف عالم ذوقی،مرگِ انبوہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۰ء،ص:۱۷۱

۷۶ ۔ ایضاً،ص:۱۷۰

۷۷ ۔ ایضاً،ص:۱۸۵

۷۸ ۔ ایضاً،ص:۱۸۹

۷۹ ۔ ایضاً،ص:۱۹۴

۸۰ ۔ ایضاً،ص:۲۰۹

۸۱ ۔ ایضاً،ص:۲۵۰

۸۲ ۔ ایضاً،ص:۳۴۶

۸۳ ۔ ایضاً،ص:۳۵۱

۸۴ ۔ ایضاً،ص:۲۹۱

۸۵ ۔ ایضاً،ص:۱۷۱

۸۶ ۔ ایضاً،ص:۲۸۷

۸۷ ۔ ایضاً،ص:۴۱۱

۸۸ ۔ ایضاً،ص:۴۱۱

۸۹ ۔ ایضاً،ص:۱۸۷

۹۰ ۔ ایضاً،ص:۱۹۳

۹۱ ۔ ایضاً،ص:۲۰۸

۹۲ ۔ ایضاً،ص:۳۱۴

۹۳ ۔ ایضاً،ص:۳۹۴

۹۴ ۔ ایضاً،ص:۲۹۴

۹۵ ۔ ایضاً،ص:۲۱۳

۹۶ ۔ ایضاً،ص:۲۷۰

۹۷ ۔ ایضاً،ص:۲۲۰

۹۸ ۔ ایضاً،ص:۲۱۵

۹۹ ۔ ایضاً،ص:۲۵۰

۱۰۰ ۔ ایضاً،ص:۲۸۵

۱۰۱ ۔ ایضاً،ص:۱۷۵

۱۰۲ ۔ ایضاً،ص:۲۲

۱۰۳ ۔ ایضاً،ص:۹۳

۱۰۴ ۔ یونس خان،مرگِ انبوہ پر جائزہ،ماہنامہ ندائے گُل،لاہور،پاکستان،نومبر دسمبر،۲۰۱۹ء،ص:۳۵

۱۰۵ ۔ مشرف عالم ذوقی،مرگِ انبوہ،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۲۰ء،ص:۱۶۰

۱۰۶ ۔ ایضاً،ص:۱۰۴

۱۰۷ ۔ ایضاً،ص:۲۲۲

۱۰۸ ۔ ایضاً،ص:۱۷۰

۱۰۹ ۔ ایضاً،ص:۴۲۲

۱۱۰ ۔ ایضاً،ص:۱۸۸

۱۱۱ ۔ ایضاً،ص:۹۸

۱۱۲ ۔ ایضاً،ص:۴۲۸

۱۱۳ ۔ ایضاً،ص:۲۶۲

۱۱۴ ۔ ایضاً،ص:۱۴۰

۱۱۵ ۔ ایضاً،ص:۴۱۶

۱۱۶ ۔ ایضاً،ص:۳۱

۱۱۷ ۔ ایضاً،ص:۱۶۴

۱۱۸ ۔ ایضاً،ص:۴۱۶

۱۱۹ ۔ ایضاً،ص:۳۰۴

۱۲۰ ۔ ایضاً،ص:۸۸

۱۲۱ ۔ ایضاً،ص:۲۷۴

۱۲۲ ۔ ایضاً،ص:۳۴۴

۱۲۳ ۔ ایضاً،ص:۱۴۷

۱۲۴ ۔ ایضاً،ص:۱۷

باب پنجم :

محاکمہ

محاکمہ

مشرف عالم ذوقی نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے انہوں نے افسانے، ناول، ناولٹ و تحقیق پر بہت لکھا، وہ نہ صرف فکشن نگار ہیں بلکہ شاعر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔

انہوں نے ڈرامے بھی لکھے جن میں سے کچھ اسٹیج پر بھی پیش کیے گئے، الیکٹرونک میڈیا میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں جو آج بھی جاری ہیں انہوں نے جس صنف میں قدم رکھا خوب نام کمایا۔

مشرف عالم ذوقی کو بچپن سے ہی کہانی لکھنے میں دلچسپی تھی انہوں نے ۱۱ سال کی عمر میں اپنا پہلا افسانہ "رشتوں کی صلیب" کے نام سے لکھا اور ۱۷ سال کی عمر میں انسانی فطرت سے بیزار نفسیاتی مریض کی کہانی کو ناول کے روپ میں پیش کر کے اسے "عقاب کی آنکھیں" کا نام دیا۔

کمسنی میں ہی انہوں نے ایک پیچیدہ مسئلے کو زیر بحث لا کر انسانی فطرت کے فلسفے کو قاری کے سامنے رکھ دیا ایسے ہی عوامل کی وجہ سے آج وہ بہترین کہانی کار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور اپنی تخلیقات کے بلبوتے آج وہ اس مقام پر ہیں۔

مشرف عالم کا تخلیقی سفر نہایت تیز رہا انہوں نے افسانوی ادب میں بھی نام کمایا اور آج عصرِ حاضر کے نمائندہ ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ذوقی اپنے خیالات میں آنے والی تبدیلی کو اپنی تحریروں میں شامل کرتے ہیں ان کی ابتدائی کہانیوں میں جذباتی لہریں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں ترقی پسندانہ خیالات نظر آنے لگے، وہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے اپنی نظریاتی تبدیلی کا اظہار کرتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں قاری کی دلچسپی کا مرکز بنتی ہیں۔

وہ اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو آنے والے تلخ دنوں کی بازیافت سناتے ہیں ان کی تحریروں کے مطالعے سے ہی قاری کے دماغ کی نئی نئی گرہیں کھلتی جاتیں ہیں اور ان کے نظریاتی بدلاؤ کو قاری بھی خود پر حاوی کر لیتا ہے۔

ذوقی کا شمار ان فکشن نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرتی ذمہ داری نبھائی ہے۔

ان کے ناولوں کی بات کی جائے تو ایک لمبی فہرست ہے جو ان کی ادبی شہرت کا سبب بنی۔

ذوقی نے موضوعاتی ناول نگاری پر خاص مہارت ہونے کے سبب اس پر زیادہ طبع آزمائی کی ہے کیونکہ ان کے اکثر ناول موضوعاتی پیرائے میں ہی دیکھے جا سکتے ہیں وہ اپنے قلم کے ساتھ مکمل انصاف کرتے ہیں۔

ذوقی کا ہر ناول ایک نئے موضوع کو بیان کرتا ہے گزشتہ ابواب میں ان پر سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے مگر ۲۰۰۰ء سے پہلے ان کے جتنے ناول منظرِ عام پر آئے ان کا مختصر تعارف یہاں بیان کرنا ضروری ہے۔

"عقاب کی آنکھیں" ان کا پہلا ناول ہے جو انہوں نے محض ۱۷ سال کی عمر میں مکمل کیا، انہوں نے اس ناول کو سقراط کے مندرجہ ذیل قول کی تشریح کہا ہے۔

"روح ایک سنگیت کی مانند ہے اور بیماریوں کی وجہ سے جسم کے اجزاء ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔۔۔روح اپنی سنگیت سے جسم میں دوبارہ جان ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔"

یہ ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں ایک کم سن بچے کا جنسی حوالے سے نفسیات کا جائزہ لیا گیا ہے انہوں نے اس میں شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کیا ہے جبکہ انداز ہ بیانیہ اپنایا ہے۔

"نیلام گھر" ایک عورت کی کہانی ہے جس میں مسلمانوں کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے اس ناول کے ذریعے ذوقی نے عورتوں کے ساتھ آئے روز ہونے والی زیادتیوں اور ان کی عزت وعصمت کو جیسے نیلام کیا جاتا ہے اس پر خصوصی توجہ دلائی ہے اس کے علاوہ بھی اس میں متعدد معاشرتی برائیوں کو عیاں کیا گیا اور فلیش بیک اور فلیش فارورڈ کی تکنیک کو مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔

"ذبح" تقسیم کے پیشِ منظر میں لکھا گیا جس میں مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کو موضوع بنایا گیا، تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا ذوقی نے اس طبقے کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو ناول میں اجاگر کیا ہے۔

"بیان" کی کہانی ہندو مسلم فسادات کے گرد گھومتی ہے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء بابری مسجد کی مسماری کے بعد ہندوستان میں ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جہاں ٹوٹتی ہوئی تہذیب کا ماتم دیکھنے کو ملتا ہے یہ ناول ذوقی کے مشہور ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا موضوع، طرزِ ادا اور زبان و بیان قاری کے دل میں ایک دیرپا اثر چھوڑتا ہے۔

"شہر چپ ہے" فلمی اور ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے اس کا موضوع دلچسپی کا حامل ہے جہاں وہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بیروزگاری اور بے بسی انسان کو جرم پر اکساتی ہے اور اپنا پیٹ بھرنے کے لئے انسان کسی کا بھی پیٹ چاک کر سکتا ہے، انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ غریب طبقے کی بے بسی اور لاچاری اسے جرائم کی دلدل میں کیسے دھکیل دیتی ہے۔

"مسلمان" ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی ہے جس میں وہ تقسیم کے بعد کی مشترکہ تہذیب کا نوحہ بھی بیان کرتے ہیں۔

اپنے اسلوب اور زبان و بیان کے سبب یہ ناول اس موضوع پر لکھے جانے والے ناولوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ذوقی نے اس ناول کے ذریعے مسلمانوں کو درپیش مشکلات کی وضاحت کی ہے، مسلمانوں پر مسلمان ہونے کی وجہ سے ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمان ہونے کے سبب بڑھتے ہوئے روزگار کے مسائل اس ناول کا موضوع ہے اس ناول میں ہندو مسلم دنگے اور فسادات کی تصویر بھی دیکھنے کو ملتی ہے، یہ ناول پہلے ہندی میں شائع ہوا اور کچھ سالوں بعد یہ اردو کے قارئین کے لئے اردو میں شائع کیا گیا۔

ذوقی کے ناولوں میں زیادہ تر سماجی موضوعات کو ہی اجاگر کیا گیا ہے وہ ناول کے اختتام کے ساتھ قاری کے لیے ایک پیغام بھی چھوڑ جاتے ہیں جس میں وہ سماج کے بگاڑ کو عیاں کرتے رہتے ہیں اور ساتھ میں سماجی برایوں کے خلاف آواز اٹھانے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔

ذوقی ناول کے پلاٹ کی بنت میں خاص توجہ دیتے ہیں وہ کہانی کو اس خوبصورتی سے بُنتے ہیں کہ کہانی میں قاری کی دلچسپی ناول کے اختتام تک جاری رہتی ہے وہ ایک باشعور اور حساس مصنف ہیں جس کی وجہ سے وہ معاشرے میں ہونے والی برائیوں کو سہنے کی ہمت نہیں رکھتے اور کھلے عام اس کا پردہ چاک کر دیتے ہیں ان کا بے باک انداز ہی قاری کا دل موہ لیتا ہے۔

ان کی کہانیاں سماج میں ہونے والی برائیوں کو آئینہ دکھانے کا کام کرتی ہیں وہ کہانی کہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ تب ہی تو وہ بغیر کسی مشکل کو خاطر میں لائے ہوئے ملک وقوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو روشن کرتے جاتے ہیں ان کے ناولوں کی کامیابی کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے۔

ذوقی کے ناولوں کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اظہار خیال مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

> "لے سانس بھی آہستہ" Ideological ناول ہے۔ تہ داری (density)
> اور تنوع اردو فکشن میں حیران کن ہے۔ feminism اور علاقائیت وغیرہ نیا
> تجربہ ہے۔ انٹرنیٹ Google وغیرہ کا سب سے زیادہ اثر ذوقی کے بیانیہ میں
> دیکھا جا سکتا ہے۔" [۱]

مشرف عالم ذوقی کی کہانیوں میں حقیقی رنگ زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے ان کے ناولوں کے مطالعے سے جو مرکزی یا ضمنی کہانیاں سامنے آتی ہیں ان میں حقیقت کی جھلک صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے اور قاری کو احساس ہوتا ہے کہ مصنف کا ان کے ساتھ واسطہ ضرور پڑا ہوگا ورنہ تخلیل اتنا حقیقت پن نہیں ظاہر کرتا ایک انٹرویو میں وہ خود بھی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

" گھر میں آنے والے لوگ زندہ کہانیوں کے کردار تھے۔ان میں ایک دودھ والی
تھی۔جو دو تین کلومیٹر دور گاؤں سے ندی پار کرتے ہوئے آتی تھی اور جب آتی تو
گاؤں کے قصے کہانیاں سنایا کرتی۔۔۔ان واقعات کا ذکر میں نے اپنے ناول
"لے سانس بھی آہستہ" میں کیا ہے۔" [۲]

ذوقی کی ادبی تربیت میں ان کے گھر کے ماحول کا بھی بہت ہاتھ تھا ان کے والد داستان گو تھے جو سب بچوں کو اکٹھا کر کے کہانیاں سنایا کرتے تھے،کم سنی میں ہی وہ متعدد ناولوں کی کہانیاں اپنے والد کی زبانی سن چکے تھے جس کا اثر ان کے ذہن میں رہا اسی سبب انہوں نے بچپن سے ہی کہانیاں لکھنی شروع کر دیں آج ان کے تصانیف میں جو پختگی نظر آتی ہے وہ اس محنت کے سبب ہے۔

نوعمری سے ہی ادب میں دلچسپی لینے کے سبب آج ان کی تصانیف مکمل طور پر جانبدار ہوتی ہیں جیسے کندن سونا بن جاتا ہے ایسے ہی ذوقی کی تصانیف اب ادب کی نمایاں شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

گلزار جاوید ان کے تخلیقی سفر کے بارے میں اپنے خیالات مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند کرتے ہیں۔

"انہوں نے اتنی کم عمری میں نہایت برق رفتاری سے وہ کارہائے نمایاں انجام دے
ڈالے جو بہت سے لوگ طویل عمری میں بھی نہیں کر پاتے۔ہم ذوقی صاحب کے
بالوں میں چاندی کا انتظار کرتے رہے اور وہ ادب کے افق پر چاند بن کر جگمگانے
لگے۔" [۳]

ذوقی کے بارے میں ایک سوال اکثر گردش میں رہتا ہے کہ آخر وہ اتنا زیادہ کیوں لکھتے ہیں ان کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست ہے جس میں وہ اپنے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں اگر سمجھا جائے تو کہا جا سکتا ہیں کہ ان کے اندر ایک بے چین روح ہے،ان کا کوئی خاص مقصد ہے جس کے لیے وہ ہمیشہ تخلیقی سفر پر نظر آتے ہیں، تلاش و جستجو کے اسی سفر کے نتیجے میں ان کی تصانیف کی ایک لمبی فہرست قائم ہو گئی ہے۔

ان کی تحریروں میں ایک بے چینی اور بے قراری نظر آتی ہے کیونکہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے روشن مستقبل کی راہیں ہموار کرنا چاہتے ہیں وہ حالات کی پیچیدگی سے واقفیت رکھتے ہیں اور آنے والی تاریکی کا احساس انہیں پریشان کرتا ہے، وہ ہندوستانی معاشرے کی عکاسی کر کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے بے راہ روا سلوک کو عیاں کرتے ہیں۔

ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ جس طرح کا سلوک حکومتِ وقت کی طرف سے روا رکھا جا رہا

میں مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کے مطالعے سے ان بے بس اور لا چار مسلمانوں کے درد کو سمجھا جا سکتا ہے، ان کے ناول مسلمانوں کی آواز کے روپ میں سامنے آئے ہیں وہ خود اس ماحول کا حصہ ہیں اور انہیں بھی مسلمان ہونے کے سبب بیشتر تکالیف و پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا اظہار بھی وہ اپنے وقتاً فوقتاً چھپنے والے ناولوں میں کرتے رہتے ہیں۔

ذوقی ہندوستان میں مسلمان قوم کے مستقبل کے حوالے سے پریشان نظر آتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمان ہونے کی سزا کتنی بھیانک دی جاتی ہے وہ نوجوان نسل کے لیے پریشانی کا اظہار "مرگِ انبوہ" اور "آتش رفتہ کا سراغ" میں کر چکے ہیں۔

صحافت میں دلچسپی رکھنے کے سبب ان کو آئے روز ایسے واقعات سننے اور دیکھنے کو ملتے ہیں جہاں مسلمان ہونے کے ناطے نوجوانوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے، جن کے لیے ملازمت کے مواقع روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اسی پیچیدہ صورتحال میں وہ اپنی پریشانی کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں، وہ کرائے کے ادیبوں میں شمار نہیں ہوتے بلکہ ان کے اندر ظالم کو للکارنے کا حل موجود ہے۔

ذوقی کے تمام ناولوں میں غیر جانبداری دیکھنے کو ملتی ہے جس کے سبب ان کے ناول اور ان کی کہانیاں ہندوستان اور پاکستان میں یکساں مقبول ہو رہی ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بے قراری اور بے چینی بڑھتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں "پوکے مان کی دنیا" لے سانس بھی آہستہ "اور" مرگ انبوہ" جیسے شاہکار سامنے آئے ہیں جن میں آزاد ملک میں بھی آزادی نہ ملنے کی کسک دیکھنے کو ملتی ہے۔

ذوقی کی تحریریں آزادی سے پہلے کے خوف کو بیان کرتی ہیں اور آزادی کے بعد کی ذہنی غلامی کی داستان رقم کرتی ہیں، ان کے ناولوں کو ہندوستانی مسلمانوں کا المیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا تمام ناولوں اور کہانیوں کے موضوعات نہایت شعلہ انگیز ہیں۔

فنکار کو معاشرے کا نبض شناس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اس معاشرے کے مرض سے آگاہی رکھتا ہوتا ہے ذوقی بھی اپنے ناولوں کے ذریعے حالات کے سدھار کے لئے کوشاں ہیں وہ ایسے کردار سامنے لاتے ہیں جو مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ناول میں اپنی ایک منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ذوقی ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے اردگرد ہونے والی زیادتیوں پر آنکھیں بند کر کے منہ پھیر لیتے ہیں بلکہ وہ صبر و تحمل سے بیٹھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے وہ جب بھی ظلم کو اپنی آنکھوں سے ہوتا دیکھتے ہیں تو اس پر اپنا ردِ عمل دینا لازمی

سمجھتے ہیں۔

ذوقی کے اندازِ بیان کے بارے میں مسلمان بن رزاق لکھتے ہیں۔

"ناول پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا تھا اگر چہ اب دنیا میں حیرت زدہ کرنے جیسا
کچھ بھی نہیں بچا ہے۔تاہم ناول میں ہمارے آس پاس کی روزمرہ بیتنے والی وارداتوں
اور باتوں کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔" [۴]

ذوقی کی کہانیوں میں بیک وقت بیانیہ، علامتی اور فنتاسی کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے، ان کے ہاں تاریخ و فلسفے کا خوبصورت ملاپ دیکھنے کو ملتا ہے۔

ذوقی کے پسندیدہ موضوعات میں تہذیبی انحطاط، تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی سیاست، میڈیکل سائنس اور نئی ٹیکنالوجی خاص طور پر شامل ہیں وہ اپنی ہر تحریر میں، ہر ناول میں مختلف موضوع اپناتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے تمام ناولوں میں امتزاج کیا جا سکتا ہے وہ صرف سیاست اور سماج کے خارجی پہلوؤں پر ہی بات نہیں کرتے بلکہ اپنی دوربین آنکھوں سے مستقبل میں ہونے والے حادثات کا بھی اندازہ لگا لیتے ہیں وہ ایک وقت میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو یکجا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں کہ

"ذوقی اپنی ہر کہانی میں فکر و خیال کی ایک نئی دنیا سمجھاتے ہیں۔اس لئے میں ذوقی کو
دنیا کے ان حساس قلم کاروں میں شامل کرتا ہوں جو نہ صرف اپنے عہد سے وابستہ ہیں
بلکہ اس سڑے گلے نظام کے لیے زندگی کا نیا فلسفہ بھی لے کر آتے ہیں۔۔۔" [۵]

ہندوستانی ادیبوں میں ۱۹۸۰ء کے بعد مشرف عالم ذوقی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے اور ان کے ناولوں کی دھوم ہے، ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ ماضی میں سانس لیتی ہوئی کہانیوں کے گٹھ جوڑ سے ناول کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی منظرنامے کے بھی گواہ بن جاتے ہیں ان کا ہر ناول جدید مشکلات سے گھرے انسان کے گرد گھومتا ہے۔

اپنے ہر ناول میں ذوقی قاری کے لئے ایک سبق لازمی چھوڑ جاتے ہیں جو ناول میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ذوقی اپنے ناولوں کے ذریعے مسلمان قوم کو نیند سے بیدار کرنے کا کام کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بیمار نظام میں رہنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا تو گھٹ گھٹ کر مر جائے یا پھر سچ کا اعلان کرتے ہوئے بہادری کی موت کا انتخاب کیا جائے۔

ذوقی نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا ہے وہ حق پر ڈٹے رہنے کو مقدم جانتے ہیں، ان کا طریقہ کار مختلف ہے اسی سبب وہ آج کے ممتاز لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ذوقی نے اپنے تمام ہمعصر لکھاریوں سے الگ پہچان بنائی ہے وہ اسلوب، زبان و بیان، تیکنیک وغیرہ میں کسی بھی مرحلے میں سمجھوتہ نہیں کرتے۔

ذوقی نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بغیر کسی جھجک کے ناولوں میں بیان کیا ہے، موضوع کے انتخاب میں وہ بے حد حساس واقع ہوئے ہیں وہ سماج اور سیاست کے ہر معاملے پر گہری نظر رکھتے ہیں، آج کے انسان کو درپیش مسائل ان کے موضوعات رہے ہیں اور خاص طور پر عورتوں کے مسائل پر خاص توجہ دیتے ہیں عورت کو آج کے مہذب سماج میں بھی دل بہلانے اور جنسی خواہشات کی تسکین کا درجہ سمجھا جاتا ہے مگر ذوقی اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ عورت آج ایک برینڈ بن چکی ہے وہ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

ذوقی کو اکثر تنقید کا سامنا اس معاملے میں کرنا پڑتا ہے کہ وہ قاری کے لئے طویل اقتباسات کا سہارا لے کر تفصیلات کا بیان کرتے ہیں ناقدین کے نزدیک شاید وہ اپنے قاری کی علمی معلومات پر بھروسہ نہیں کرتے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ قاری ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہے اس حوالے سے شموئل احمد لکھتے ہیں کہ۔

> "بیانیہ کے شروع میں تخلیقیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ذوقی اسلوب کا آہنگ برقرار
> نہیں رکھ سکے لہجہ اچانک خطیبانہ ہوجاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی دانشوری قاری
> پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ یہ دانشوری بیانیہ کے درون سے نہیں ابھرتی بلکہ کسی ڈاکومنٹری
> کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔" [٦]

شموئل احمد مزید لکھتے ہیں کے ذوقی ناولوں میں جن مغرب مشاہیر کے حوالے دیتے ہیں ان میں اکثر غلط بہت ہوتے ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے وسیع مطالعے کا احساس تو دلانا چاہتے ہیں مگر ناقدین کی نظر اس پر پڑ ہی جاتی ہے اور ان کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے، شموئل احمد اسی کالم میں آگے جا کر لکھتے ہیں۔

> "ذوقی ہارر اور جاسوسی ادب نہیں لکھتے پھر بھی خود کو پوکو کے قریب محسوس کرتے ہیں۔
> یہ بات گلے سے نہیں اترتی۔ حد تو یہ ہے کہ ناگ کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں وہ
> ندافاضلی کے اس شعر کو عادل منصوری کا شعر بتاتے ہیں۔
> سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
> کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگی" [٧]

مشرف عالم ذوقی کی تحریروں پر قارئین اور ناقدین اپنی رائے دیتے رہتے ہیں جہاں ان کو تعریف سننے کو ملتی ہیں

وہیں تنقید بھی ان کے حصے میں آتی، اپنی ان چند خامیوں پر جن کا اشارہ اوپر دیا جا چکا ہے وہ قابو پا لیتے ہیں تو یقیناً عصرِ حاضر کے تمام ناول نگاروں کو مات دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور مستقبل کا نقادان کو عصرِ حاضر کے معتبر تخلیق کاروں میں سرِ فہرست رکھ کر دیکھے گا۔

بھارت سے ڈاکٹر سید احمد قادری ذوقی کے تخلیقی سفر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"ذوقی کی تلاش و جستجو کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی کئی موتیوں کو ذوقی نے حاصل بھی کیا ہے۔۔۔ ذوقی کے اندر جو فنکارانہ شعور وادراک ہے اور فکر واحساس کو جو آگہی، تازگی، ندرت اور سنجیدگی ہے، وہ انہیں مائل بہ ارتقاء رکھے گا۔۔۔" [۸]

امید کرتی ہوں کہ جن انمول موتیوں کو پانے کی خواہش وہ رکھتے ہیں وہ پوری ہو اور ان کی آنے والی تخلیقات مزید جاذبِ نظر اور دلکش ہوں جس میں وہ اپنی تمام خامیوں کو پسِ پشت ڈال کر صرف خوبیوں کو بروئے کار لائیں اور ناول کی تاریخ میں مزید کامیاب اضافے عمل میں آئیں۔

حوالہ جات

۱ ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، انسانیت سے محبت، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۷

۲ ۔ مشرف عالم ذوقی، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۸

۳ ۔ گلزار جاوید، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۷

۴ ۔ سلمان بن رزاق، آج کی جنریشن، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۳۸

۵ ۔ ڈاکٹر مشتاق احمد، منٹو سے ذوقی تک، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۴۰

۶ ۔ شموئل احمد، نئے ناول کا بیانیہ، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۵۳

۷ ۔ ایضاً، ص: ۵۳

۸ ۔ ڈاکٹر سید احمد قادری، عہد ساز افسانہ نگار، چہارسو، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری، فروری ۲۰۱۷ء، ص: ۳۷

کتابیات

کتابیات

ابتدائی ماخذات

۱۔ مشرف عالم ذوقی، پوکے مان کی دنیا، صریر پبلی کیشنز، لاہور، راولپنڈی، ۲۰۱۹ء
۲۔ ایضاً، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، ساشا پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۵ء
۳۔ ایضاً، لے سانس بھی آہستہ، ساشا پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۰۸ء
۴۔ ایضاً، آتش رفتہ کا سُراغ، ساشا پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۳ء
۵۔ ایضاً، نالۂ شب گیر، ذوقی پبلیکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء
۶۔ ایضاً، مرگِ انبوہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء
۷۔ ایضاً، سلسلہ شب وروز، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ۲۰۱۴ء

تنقیدی و تحقیقی کتب

۱۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، فکشن ہاؤس لاہور اشاعت دوئم، ۲۰۱۷ء
۲۔ رحمٰن عباس، اکیسویں صدی میں اردو ناول، سہ ماہی سمت، اجولائی ۲۰۱۶ء
۳۔ رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر، معاصر اُردو ناول، قلم پبلی کیشنز، دہلی، مارچ، ۲۰۰۱ء
۴۔ قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ہم عصر اُردو ناول: ایک مطالعہ، ایم۔آر۔ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۰۷ء
۵۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، اپریل، ۲۰۰۹ء
۶۔ مشتاق احمد، ڈاکٹر، جدید حسیت کا فکشن نگار: ذوقی، ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۴ء
۷۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء
۸۔ منصور خوشتر، اُردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء
۹۔ نازغہ قندیل، اردو ناول میں زوال فطرت انسانی کی تمثیلات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان اور مثال پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

تحقیقی مقالات

۱ ۔ سمعیہ بشیر، ذوقی کی ادبی خدمات، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء

۲ ۔ شیخ لطیف، مشرف عالم ذوقی کی ہندی کہانیوں میں سمپر دایکتہ، پی۔ایچ۔ڈی تھیسس

اخبارات/ رسائل وجرائد

۱ ۔ احمد جاوید، نالۂ شب گیر، ایک قاری کے تاثرات، روزنامہ متاع آخرت کانپور، ۶ مارچ، ۲۰۱۶ء، اتوار

۲ ۔ ذاکر فیضی، ڈاکٹر، مشرف عالم ذوقی اور ناول مرگِ انبوہ‘ قومی تنظیم، پٹنہ ، ۲۰۲۰ء، مارچ، سوموار

۳ ۔ سلمان بن رزاق، آج کی جنریشن، چہارسو، جلد ۲۶ شمارہ: جنوری فروری، ۲۰۱۷ء

۴ ۔ سید احمد قادری، عہد ساز افسانہ نگار، ایضاً

۵ ۔ سیمیں کرن، نالۂ شب گیر ایک ضروری مکالمہ: عورتوں کے تعلق سے، روزنامہ متاع آخرت کانپور، ۳ جنوری، ۲۰۱۶ء، اتوار

۶ ۔ شموئل احمد، نئے ناول کا بیانیہ، چہارسو، جلد ۲۶ شمارہ: جنوری فروری ۲۰۱۳ء

۷ ۔ عمران عاکف خان، ادبی گوشہ، روزنامہ متاع آخرت کانپور، ۱۷، اگست، ۲۰۱۴ء ، اتوار

۸ ۔ گلزار جاوید، مشرف عالم ذوقی (انٹرویو) ماہنامہ، چہارسو، راولپنڈی، جنوری فروری، ۲۰۱۷ء

۹ ۔ گوپی چند نارنگ، انسانیت سے محبت، ایضاً

۱۰ ۔ مشتاق احمد، منٹو سے ذوقی تک، ایضاً

۱۱ ۔ مشرف عالم ذوقی، میرا تخلیقی سفر، عالمی جائزہ، مدیر عبدالرحمٰن ایڈوکیٹ، شمارہ: جنوری تا مارچ

۱۲ ۔ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، اپریل، ۲۰۰۹ء

۱۳ ۔ منظر اعجاز، ڈاکٹر، چہارسو، ماہنامہ، بانی مدیر سید ضمیر جعفری، راولپنڈی، جلد ۲۶، شمارہ: جنوری فروری، ۲۰۱۷ء

۱۴ ۔ یونس خان، مرگِ انبوہ پر جائزہ، ماہنامہ ندائے گل، لاہور، پاکستان، نومبر ستمبر، ۲۰۱۹ء

ویب گاہیں

۱ ۔ https://m.facebook.com/story.php?stary_fbid=102212111923286&id=1260581814

۲ ۔ https:?PHP.com/stroy.fb.m//stroy-FB=